تعلیم و تربیت
آئی سی سی
کرکٹ ورلڈ کپ
2015ء
فروری 2015
PAKISTAN
WWW.PAKSOCIETY.COM

آئی سی سی کرکٹ ورلڈ کپ 2015ء شیڈول

تاریخ	میچ	مقام	ٹائم
14 فروری ہفتہ	نیوزی لینڈ بمقابلہ سری لنکا	کرائسٹ چرچ	صبح 3:00 بجے
14 فروری ہفتہ	آسٹریلیا بمقابلہ انگلینڈ	میلبورن	صبح 8:30 بجے
15 فروری اتوار	ساؤتھ افریقہ بمقابلہ زمبابوے	ہیملٹن	صبح 6:00 بجے
15 فروری اتوار	انڈیا بمقابلہ پاکستان	ایڈلیڈ	صبح 8:30 بجے
16 فروری پیر	آئرلینڈ بمقابلہ ویسٹ انڈیز	نیلسن	صبح 3:00 بجے
17 فروری منگل	نیوزی لینڈ بمقابلہ سکاٹ لینڈ	ڈیونڈن	صبح 3:00 بجے
18 فروری بدھ	افغانستان بمقابلہ بنگلہ دیش	کینبرا	صبح 8:30 بجے
19 فروری جمعرات	زمبابوے بمقابلہ یو اے ای	نیلسن	صبح 3:00 بجے
20 فروری جمعہ	نیوزی لینڈ بمقابلہ انگلینڈ	ویلنگٹن	صبح 6:00 بجے
21 فروری ہفتہ	پاکستان بمقابلہ ویسٹ انڈیز	کرائسٹ چرچ	صبح 3:00 بجے
21 فروری ہفتہ	آسٹریلیا بمقابلہ بنگلہ دیش	برسبین	صبح 8:30 بجے
22 فروری اتوار	افغانستان بمقابلہ سری لنکا	ڈیونڈن	صبح 3:00 بجے
22 فروری اتوار	انڈیا بمقابلہ ساؤتھ افریقہ	میلبورن	صبح 8:30 بجے
23 فروری پیر	انگلینڈ بمقابلہ سکاٹ لینڈ	کرائسٹ چرچ	صبح 3:00 بجے
24 فروری منگل	ویسٹ انڈیز بمقابلہ زمبابوے	کینبرا	صبح 8:30 بجے
25 فروری بدھ	آئرلینڈ بمقابلہ یو اے ای	برسبین	صبح 8:30 بجے
26 فروری جمعرات	افغانستان بمقابلہ سکاٹ لینڈ	ڈیونڈن	صبح 3:00 بجے
26 فروری جمعرات	بنگلہ دیش بمقابلہ سری لنکا	میلبورن	صبح 8:30 بجے
27 فروری جمعہ	ساؤتھ افریقہ بمقابلہ ویسٹ انڈیز	سڈنی	صبح 8:30 بجے
28 فروری ہفتہ	نیوزی لینڈ بمقابلہ آسٹریلیا	آکلینڈ	صبح 6:00 بجے
28 فروری ہفتہ	انڈیا بمقابلہ یو اے ای	پرتھ	صبح 11:30 بجے
01 مارچ اتوار	انگلینڈ بمقابلہ سری لنکا	ویلنگٹن	صبح 3:00 بجے
01 مارچ اتوار	پاکستان بمقابلہ زمبابوے	برسبین	صبح 8:30 بجے
03 مارچ منگل	آئرلینڈ بمقابلہ ساؤتھ افریقہ	کینبرا	صبح 8:30 بجے
04 مارچ بدھ	پاکستان بمقابلہ یو اے ای	نیپیئر	صبح 6:00 بجے
04 مارچ بدھ	آسٹریلیا بمقابلہ افغانستان	پرتھ	صبح 11:00 بجے
05 مارچ جمعرات	بنگلہ دیش بمقابلہ سکاٹ لینڈ	نیلسن	صبح 3:00 بجے
06 مارچ جمعہ	انڈیا بمقابلہ ویسٹ انڈیز	پرتھ	صبح 11:00 بجے
07 مارچ ہفتہ	پاکستان بمقابلہ ساؤتھ افریقہ	آکلینڈ	صبح 6:00 بجے
07 مارچ ہفتہ	آئرلینڈ بمقابلہ زمبابوے	ہوبارٹ	صبح 8:30 بجے
08 مارچ اتوار	نیوزی لینڈ بمقابلہ افغانستان	نیپیئر	صبح 3:00 بجے
08 مارچ اتوار	آسٹریلیا بمقابلہ سری لنکا	سڈنی	صبح 8:30 بجے
09 مارچ پیر	انگلینڈ بمقابلہ بنگلہ دیش	ایڈلیڈ	صبح 8:30 بجے
10 مارچ منگل	انڈیا بمقابلہ آئرلینڈ	ہیملٹن	صبح 6:00 بجے
11 مارچ بدھ	سری لنکا بمقابلہ سکاٹ لینڈ	ہوبارٹ	صبح 8:30 بجے
12 مارچ جمعرات	ساؤتھ افریقہ بمقابلہ یو اے ای	ویلنگٹن	صبح 6:00 بجے
13 مارچ جمعہ	نیوزی لینڈ بمقابلہ بنگلہ دیش	ہیملٹن	صبح 6:00 بجے
13 مارچ جمعہ	افغانستان بمقابلہ انگلینڈ	سڈنی	صبح 8:30 بجے
14 مارچ ہفتہ	انڈیا بمقابلہ زمبابوے	آکلینڈ	صبح 6:00 بجے
14 مارچ ہفتہ	آسٹریلیا بمقابلہ سکاٹ لینڈ	ہوبارٹ	صبح 8:30 بجے
15 مارچ اتوار	ویسٹ انڈیز بمقابلہ یو اے ای	نیپیئر	صبح 3:00 بجے
15 مارچ اتوار	آئرلینڈ بمقابلہ پاکستان	ایڈلیڈ	صبح 8:30 بجے

تاریخ	میچ	مقام	ٹائم
18 مارچ 2015 بدھ	پہلا کوارٹر فائنل	سڈنی	صبح 8:30 بجے
19 مارچ 2015 جمعرات	دوسرا کوارٹر فائنل	میلبورن	صبح 8:30 بجے
20 مارچ 2015 جمعہ	تیسرا کوارٹر فائنل	ایڈلیڈ	صبح 8:30 بجے
21 مارچ 2015 ہفتہ	چوتھا کوارٹر فائنل	ویلنگٹن	صبح 8:30 بجے
24 مارچ 2015 منگل	پہلا سیمی فائنل	آکلینڈ	صبح 8:30 بجے
26 مارچ 2015 جمعرات	دوسرا سیمی فائنل	سڈنی	صبح 8:30 بجے
29 مارچ 2015 اتوار	فائنل	میلبورن	صبح 8:30 بجے

[illegible]	[illegible]
آسٹریلیا	پاکستان
سری لنکا	انڈیا
انگلینڈ	ساؤتھ افریقہ
نیوزی لینڈ	زمبابوے
بنگلہ دیش	آئرلینڈ
افغانستان	یو اے ای
سکاٹ لینڈ	ویسٹ انڈیز

حمد باری تعالیٰ

ازل سے لے کر اس کی ذات ابد تک
خرد کس طرح پہنچے اس کی حد تک

وہ سب کے واسطے روزی رساں ہے
ہیں اس کے معترف سب نیک و بد تک

جہاں میں کوئی کتنا بھی بڑا ہو
نہ پہنچے گا کبھی وہ اس کے "قد" تک

فقط انساں ہی کب رہینِ کرم ہیں
ہیں اس کے زیرِ احساں دام و دد تک

وہی صورت گرِ نوعِ بشر ہے
بناتا ہے وہی سب خال و خد تک

وہ انساں کی سمجھ میں کیسے آئے
یہاں بیکار ہیں عقل و خرد تک

اسی کے ہیں سمندر اور دریا
اسی کے ہیں یہ سارے جزر و مد تک

اگر ہم اُس کے احساں گننا چاہیں
تو ہم گِن لیں گے آخر کس عدد تک

ہر انساں اُس کا ہے محتاج برقیؔ!
جہاں میں مہد سے لے کر لحد تک

خالد برقی

نعت رسول مقبول

گل افشاں گل افشاں ہے روئے محمد ﷺ
پریشاں پریشاں ہے بوئے محمد ﷺ

منور منور جبینِ محمد ﷺ
فروزاں فروزاں ہے موئے محمد ﷺ

محمد ﷺ کی مسجد ہے جنت کا ٹکڑا
خیاباں خیاباں ہے کوئے محمد ﷺ

محمد ﷺ کی صحبت ملی جن کو ان میں
درخشاں درخشاں ہے خوئے محمد ﷺ

وہ خلقِ خدا، وہ شفاعت کی طالب
خراماں خراماں ہے سوئے محمد ﷺ

سنو حشر کے تشنہ کامو! یہ مژدہ
فراواں فراواں ہے جوئے محمد ﷺ

منظور آفاقی

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے پانی سے ہر جان دار چیز کو بنایا۔'' (الانبیاء، آیت:30)

پیارے بچو! پانی کے قطرے میں اللہ تعالیٰ نے بڑھنے اور پھیلنے کی قدرت رکھی ہے۔ یہ پانی کا قطرہ بارش کی صورت برستا ہے، اس کی کاری گری مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ جب یہ قطرہ صدف کے منہ میں جاتا ہے تو موتی بن کر نکلتا ہے۔ جب یہ قطرہ سانپ کے منہ میں جاتا ہے تو زہر کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔ یہی قطرہ ہرن کے منہ میں جاتا ہے تو مشک بن کر نکلتا ہے اور جب یہ قطرہ بکری کے منہ میں جاتا ہے تو دودھ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب یہ قطرہ پھل دار درختوں کی جڑ میں پہنچتا ہے تو مزے دار پھلوں کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہی قطرہ گندم اور جو وغیرہ کی جڑ میں جا پہنچتا ہے تو اناج اور غلہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب یہی قطرہ بیل بوٹوں کی جڑوں کو جا لگتا ہے تو خوب رو پھولوں اور حسین سبزہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جب یہ قطرہ انسان کے منہ میں جاتا ہے تو اس کی زندگی کا سامان بنتا ہے۔

کرۂ ارض کی اکثر آبادی کسی نالے، دریا اور سمندر کے آس پاس ہی ملتی ہے، اس سے انسان کی حیات میں پانی کی قدر اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا واقعہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ کرۂ ارض کی آباد کاری میں پانی کو بے حد دخل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنے ننھے فرزند اسماعیل کو ان کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ مکہ کے چٹیل و بیابان میدان میں چھوڑ دیا۔ پھر وہ ننھا بچہ پیاس سے بے تاب ہوا۔ ماں اس کی بے تابی دیکھ کر پریشان ہوئی اور صفا و مروہ کے چکر کاٹنے لگی۔ اس دوران بچے نے بے تاب ہو کر ایڑیاں زمین پر ماریں تو رب تعالیٰ کی قدرت سے زمین سے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ اتنا پانی نکلا کہ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے کہا: ''زم زم.....'' یعنی بس بس..... تو اس پانی کا نام ہی ''زم زم'' ہو گیا۔ پھر وہی پانی ان کی پیاس تھا اور غذا تھا اور آج تک وہ چشمہ بہہ رہا ہے اور دُنیا اس متبرک پانی کو نوش کر رہی ہے۔ جب اس چٹیل میدان میں پانی نکلا تو پرندوں نے اپنی زندگی کی بقا کے لیے اس میدان کا رخ کیا اور پرندوں کے اس جانب رخ کرنے کی وجہ سے قبیلۂ جرہم نے اپنی منزل کی تلاش کی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اجازت سے اس بے آباد جگہ کو آباد کیا۔

کرۂ ارض کا تین چوتھائی حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود پانی کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ دریا ہوں، سمندر یا خلیجیں، ہر ملک کا مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہے۔ انسانی جسم کے خلیات میں بے شمار چیزیں ہوتی ہیں مگر اس میں پانی سب سے اہم اور زیادہ ہے۔ خون انسان کے پورے جسم میں گردش کرتا ہے، اس کا بڑا حصہ بھی پانی پر مشتمل ہے۔ اسی طرح تمام زندہ اشیاء کا بڑا حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر زندہ چیز 70 تا 75 فی صد پانی رکھتی ہے۔

پانی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں جن عمدہ چیزوں کے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، اس میں سے ایک پانی بھی ہے۔ میٹھا، شیریں اور صاف پانی جس کے پینے سے فرحت اور سرور حاصل ہو گا۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جس جنت کا نیک لوگوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی نہریں ایسے پانی کی ہیں جن میں ذرا تبدیلی نہ ہو گی۔'' (محمد:15)

اس لیے پیارے بچو! جب آپ پانی کی عظیم نعمت سے لطف اندوز ہوں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر پانی پئیں اور جب پانی پی کر فارغ ہوں تو الحمد للہ کہہ کر اپنے پیارے رب کا شکریہ ادا کریں جس نے یہ انمول عطیہ ہمیں عطا کیا ہے۔ (از مفہوم ترمذی شریف:1885)

کشمیر کے ایک گاؤں میں جھرنے کے پاس ایک درخت پر بلبل رہتی تھی۔ وہ سدا چہکتی رہتی تھی لیکن اب اس نے چہکنا بند کر دیا تھا۔ اس نے فضا میں بارود کی بُو سونگھ لی تھی۔ آبشار کے پانی میں خون کی آمیزش دیکھ لی تھی۔ اب وہ اُداسی سے درخت کی شاخ پر بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی نظر دُور گاؤں کے کچے پکے مکانات پر جمی رہتی تھی۔ اس گاؤں میں امن پسند لوگ رہتے تھے۔ وہ سارا دن اپنے کھیتوں یا گھریلو کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ملک میں کیا ہو رہا ہے یا دُنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس بات کی نہ تو انہیں خبر تھی اور نہ ہی دلچسپی...... لیکن اب پچھلے دو ہفتوں سے سارے حالات بدل گئے تھے۔ بھارتی فوج کا ایک دستہ اس گاؤں میں آیا تھا۔ تب سے فضا میں بارود کی بُو تھی اور پانی میں خون کی آمیزش تھی اور بلبل نے اپنی سُریلی آواز میں گانا بند کر دیا تھا اور گاؤں کے امن کو جیسے نظر لگ گئی تھی۔

رحمت علی کھیت مزدور تھا۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ جب سے امن خراب ہوا تھا، وہ گھر سے باہر جانے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس کے کتنے ہی ساتھیوں کو بھارتی فوج نے پکڑ لیا تھا اور کسی نامعلوم جگہ پر بند کر رکھا تھا۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ رحمت علی کو موسم سرما کے استقبال کی تیاری کرنا تھی۔ خشک لکڑیاں جمع کرنا تھیں۔ اپنے گھر والوں کے لیے خوراک کا انتظام کرنا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بھارتی فوجی شکاری کتوں کی مانند بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ انہیں اپنے الفاظ میں دہشت گردوں کو گرفتار کرنا تھا لیکن یہاں تو انہیں بس محنت کش ہی مل رہے تھے۔ انہیں اپنے افسروں کو جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔

اس رات رحمت علی اپنے دو بچوں کے ساتھ لحاف میں دبکا ہوا تھا کہ ''دھپ'' کی آواز آئی۔

''خدایا خیر......'' رحمت علی نے دُعا مانگی۔ پھر رحمت علی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے بہت سے لوگ گھر میں گھس آئے ہوں۔ اب لحاف میں رہنا رحمت علی کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اُٹھا تو بچے بھی نیند سے جاگ اُٹھے۔ اسی لمحے کسی نے پوری قوت سے کمرے کے دروازے پر اپنی لات ماری۔ کمزور دروازہ اندر کی طرف آ گرا۔ رحمت علی نے دیکھا، وہ جدید اسلحہ سے لیس بھارتی فوجی تھے۔ ان میں سے ایک حلق کے بل چیخا۔

''صالح احمد کو تم نے کہاں چھپایا ہے؟'' رحمت علی حیران رہ گیا۔

''کون صالح احمد...... میں کسی کو نہیں جانتا۔''

’’جھوٹ بولتا ہے پاجی......‘‘ ایک بھارتی فوجی نے اپنی بندوق کا بٹ رحمت علی کے سینے پر دے مارا۔ رحمت علی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ رحمت علی کی بیوی اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی۔ بھارتی فوجی سمجھے کہ وہ ان پر حملہ کرنے آ رہی ہے۔ ایک بھارتی فوجی نے اپنی بندوق سیدھی کر کے آہنی سنگین اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور پھر مخالف سمت میں جھٹکا دیا۔ رحمت علی کی بیوی کی انتڑیاں زمین پر آ گریں۔ اس کی آخری چیخ بہت ہولناک تھی۔ صدمے سے رحمت علی بے ہوش ہو گیا۔ وہ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب رحمت علی کی آنکھ کھل گئی۔ کتنی دیر تک وہ خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھورتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی یادداشت واپس لوٹ رہی تھی۔ اسے اپنے سینے میں درد کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک کونے میں اس کی بیوی کا سرد جسم پڑا تھا۔ پھر وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ ان چیخوں میں بہت درد تھا۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کی کٹی لاشیں دیکھ لی تھیں۔ گاؤں کے لوگ اس کی چیخیں سن رہے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر رحمت علی کی دل جوئی کرتے۔ رحمت علی کی دُنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اس کے جینے کا مقصد اپنی بیوی بچوں کی موت کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔ یہ موت جیسا سناٹا تھا۔ یہ بات انسان کے لاشعور میں ہے، وہ اپنی زندگی کو موت سے بچانے کے لیے ساری زندگی کوشش کرتا رہتا ہے اور موت اس کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ کبھی کسی حادثے کی صورت میں، کبھی کسی بیماری کی صورت میں اور آخر میں جیت موت کی ہوتی ہے۔ زندگی سے محبت، موت سے ڈر پیدا کرتی ہے۔ رحمت علی کا اپنا کوئی نہیں رہا تھا اور اب اسے زندگی سے محبت بھی نہیں رہی تھی۔ اب تو اسے انتقام لینا تھا۔ اب تک اس گاؤں میں کوئی دہشت گرد موجود نہیں تھا۔ اب اس گاؤں میں رحمت علی کے نام سے ایک دہشت گرد ظلم کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا۔ رحمت علی اپنے کمرے میں سے باہر نکلا۔ باہر ایک تیز دھار کلہاڑی پڑی تھی۔ اب تک رحمت علی اس کلہاڑی کی مدد سے لکڑیاں کاٹتا تھا۔ اب اسے ان ظالموں کے سر کاٹنے تھے جنہوں نے اس کی ہنستی بستی زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ کلہاڑی اُٹھائے رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکلا۔ اس کا رُخ بھارتی فوجی چھاؤنی کی طرف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس راستے میں وہ مر جائے گا لیکن اس کی نیت تھی کہ جتنے بھی ظالموں کو وہ جہنم واصل کر سکتا ہے، وہ کرے گا۔ وہ گاؤں کی حدود میں سے باہر نکل آیا۔ جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ چند سائے اس کے تعاقب میں تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پتوں کی سرسراہٹ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

’’سامنے آؤ...... میں تم لوگوں سے ڈرتا نہیں ہوں۔‘‘ رحمت علی نے للکار کر کہا۔ فوراً ہی ایک آدمی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ چاند کی روشنی میں رحمت علی نے دیکھا، وہ ایک خوب صورت آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ گھنی داڑھی موجود تھی۔

’’کون ہو تم......؟‘‘ رحمت علی بولا۔

’’میں صالح احمد......‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

’’اچھا تو وہ تم ہی ہو جس کی وجہ سے میرے گھر کے تمام افراد مارے گئے۔‘‘ رحمت علی کی آواز میں صدمہ تھا۔

’’تم نے غلط سمجھا۔ ہم نے ہتھیار کیوں اُٹھایا۔ تم نے ہتھیار کیوں اُٹھایا۔ ہم تو امن چاہتے تھے۔ ہم تو آزادی چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مظالم کی وجہ سے ہمیں ہتھیار اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ہم سب کی کہانی ایک جیسی ہے۔‘‘ صالح احمد غم سے بولا۔

ایک لیموں ہزار فائدے

لیموں یا نیبو مزے میں کھٹا اور فائدے میں میٹھا ہوتا ہے۔ پھل کہہ لو یا ترکاری، نام میں کیا رکھا ہے۔ صحت وتن درستی کے لیے لیموں قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ صبح اُٹھتے ہی نہار منہ ایک گلاس پانی میں لیموں نچوڑ کر پی لو۔ اس سے معدے اور جگر میں طاقت آئے گی۔ کبھی بدہضمی نہیں ہوگی۔ خون بھی صاف ہوگا اور چہرے کی رنگت بھی نکھرے گی۔

سر میں درد ہو تو آدھے گلاس پانی میں ایک لیموں نچوڑ دو اور اس میں چٹکی بھر ’’بائی کاربونیٹ آف سوڈا‘‘ ملا کر پی لو۔ چند منٹوں میں درد کافور ہو جائے گا۔ نزلہ یا زکام ہو تو پہلے گرم پانی سے نہاؤ۔ پھر ایک گلاس گرم پانی میں ایک لیموں کا رس اور چمچا بھر شہد ملا کر پیو۔ نہ نزلہ رہے گا نہ زکام۔ لیموں قبض کے لیے بھی مفید ہے۔ رات کو چمچ بھر کشمش یا بے بیج کے منقے آدھے گلاس پانی میں بھگو دو۔ اوپر سے ایک لیموں نچوڑ دو۔ صبح جاگتے ہی کشمش کھا کر پانی پی لو۔ دو ایک دن میں قبض دور ہو جائے گا۔

''سچ کہتے ہو لیکن مجھے آزادی اور امن کے ساتھ ساتھ انتقام بھی چاہیے۔'' رحمت علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اسی لیے تو ہم یہاں آئے ہیں۔ ہمیں خبر ملی تھی کہ یہاں بھارتی فوجی مظالم کر رہے ہیں لیکن افسوس ہمیں آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔''

صالح احمد کی آواز میں شرمندگی تھی۔ وہ جس درخت کے نیچے کھڑے تھے اس پر بلبل کا گھونسلا تھا۔ وہ دو ہفتوں سے مظالم ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی جو حساب لینے آئے تھے۔ جانے کیوں بلبل کے دل میں خوشی کی کونپل کھل اٹھی۔ وہ مسرت سے بولی: کو......کو......کو......''

''چلو چلتے ہیں......'' صالح احمد کی آواز پر اس کے پیچھے ہوئے ساتھی بھی باہر آ گئے تھے۔ پھر سب مل کر بھارتی فوجی چھاؤنی کی طرف بڑھے۔ تمام بھارتی فوجی ایک بڑے کمرے میں شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد سکون کی نیند سو رہے تھے۔ دو پہرے دار ان کی حفاظت پر مامور تھے لیکن وہ بھی اب ساری رات کے بعد اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ رحمت علی نے سب کو پیچھے روک دیا تھا۔ یہ اس کا انتقام تھا۔ اس انتقام میں اسے کسی کی بھی شراکت قبول نہیں تھی۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ تیز دھار کلہاڑی اس کے پاس موجود تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی بچوں کے لاشے تھے۔ اس کا ہاتھ بلند ہوا اور پھر ہوا میں ہی معلق ہو کر رہ گیا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ پھر اسے عقب سے صالح احمد کی سرگوشی سنائی دی۔

''حملہ کرو! ہم تمہارے ساتھ ہیں...... اپنے بیوی بچوں کا انتقام لو۔'' لیکن رحمت علی نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ کلہاڑی والا ہاتھ نیچے آ چکا تھا۔ پھر وہ واپسی کے لیے قدم اٹھانے لگا۔

''کیا ہوا......تم رُک کیوں گئے؟'' صالح احمد کی حیرت کا عالم دیدنی تھا۔

انہوں نے میری بیوی بچوں کو قتل کیا۔ میرے وجود میں غم اور دکھوں کا اک طوفان موجزن ہے۔ میں ان سے انتقام لینے آیا تھا اور یہ میرے لیے کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ میں تو بس یہ سوچ کر رُک گیا کہ ان سب کی موت کے بعد ان کی بیوی بچوں پر کیا گزرے گی۔ یہ آزادی کا راستہ نہیں ہے۔ یہ امن کا راستہ نہیں ہے، میں تلاش کروں گا وہ کون سا راستہ ہے جو ہمیں آزادی اور امن کی طرف لے جائے گا۔ میں تلاش کروں گا......'' رحمت علی کلہاڑی پھینک کر آگے بڑھ گیا۔ صالح احمد اسے جاتے ہوئے یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی دوسری دُنیا کا آدمی ہو اور ہندو فوجی خواب غفلت کی نیند سوتے رہ گئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ رات کے پچھلے پہر کون ان کی موت بن کر ان کے سر پر پہنچا تھا اور بھیک میں ان کی زندگی پر تھوک کر چلا گیا تھا۔ رحمت علی نے امن کا راستہ چنا تھا، جس پر چل کر اسے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے آزادی حاصل کرنا تھی۔

☆☆☆

"میں تو اپنی کلاس میں بیٹھا انسانیت کی خدمت اور ابتدائی طبی امداد کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ جس انسانیت کی خدمت میں کرنا چاہتا ہوں، اسی کے لبادے میں چھپے کچھ لوگوں نے میرے سفید یونیفارم کو میرے لہو سے رنگ دینا ہے۔ ان لوگوں میں سے ایک آگے بڑھا، اس نے میرے سر پر پستول رکھی۔ میں سہم گیا، پھر زور سے چلایا، مجھے چھوڑ دو...... مجھے کچھ نہ کہو...... میں نے کچھ نہیں کیا...... امی مجھے بچا لیں! لیکن ایک جنبش ہوئی اور پھر مجھ سے زندہ رہنے اور سانس لینے کا حق چھین لیا گیا۔ میں تو لحد کی گود میں اُتر کر ابدی نیند سو گیا مگر مجھے اب بھی یہ جاننا ہے کہ مجھ سے میرے بولنے، زندہ رہنے اور سانس لینے کا حق کیوں چھینا گیا؟ اب کون بڑھاپے میں میری ماں کا سہارا اور میرے باپ کا سنبھالا بنے گا؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا، میں نے آخر ایسا کیا کیا تھا؟ میرے خون کا ایک ایک قطرہ چیخ چیخ کر یہی سوال کرتا رہے گا کہ آخر میرا قصور کیا تھا؟"

آرمی پبلک اسکول پشاور کو سفاک درندوں نے خون میں نہلا دیا۔ چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہو گیا؟ ان بھیڑیوں نے گلشنِ وطن کے 143 پھول خون میں نہلا دیے اور آرمی پبلک ہائی اسکول پشاور کی پرنسپل، خاتون اُستاد اور دوسرے سات افراد کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ تاریخ بھی 16 دسمبر تھی جس کی آمد سے پُرانے زخم ہرے ہو جاتے ہیں اور ضمیر کے اندر احساس کا خنجر پیوست ہو جاتا ہے۔ اب ہماری تاریخ میں ایک اور قومی سانحہ در آیا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہمارے حال اور ہمارے مستقبل پر ایک اندوہناک حملہ ہوا جس پر پورا ملک بلکہ پورا عالم نوحہ کناں اور سوگوار ہے۔ ننھے ننھے پھول سے بچوں کے جنازے اُٹھ رہے ہیں اور ایک شورِ محشر بپا ہے۔ جگہ جگہ غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی جا رہی ہیں اور شہداء کی بلندیٔ درجات کے لیے بے اختیار ہاتھ اُٹھ رہے ہیں۔ سسکیاں ہیں، آہیں ہیں اور ہر چشم بیدار سے درد کا دریا بہہ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا غم ہے جسے ہم برسوں بھلا نہ سکیں گے۔

سانحۂ پشاور نے ہمارے ناخداؤں کو آنے والی تباہی کا شدید احساس دلایا ہے اور پوری قوم کو ہلا کر اور جھنجوڑ کے رکھ دیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری دُنیا پر ایک لرزہ طاری ہوا ہے اور نو سے سولہ سالہ لڑکوں کے بہیمانہ قتل سے انسانی ضمیر میں درد کی ایک شدید ٹیس اُٹھی ہے اور پورے خطے میں ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔

16 دسمبر کی صبح، سورج کا نکلنا، چڑیوں کا چہچہانا اور گھروں

میں ماؤں کا اپنے بچوں کو جگانا اور ان بچوں کا سخت سردی میں بڑی مشکل سے اپنے بستر سے نکل کر اسکول کے لیے تیار ہونا، سب معمول کے مطابق تھا لیکن بچوں کو اسکول بھیجنے والی اس ماں کو کیا معلوم تھا کہ آج جو وہ اپنے بچے کو اسکول بھیج رہی ہے وہ درحقیقت اسے موت کے حوالے کر رہی ہے، اس ماں کو کیا معلوم تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اسکول جاتے ہوئے آج آخری بار دیکھ رہی ہے اور اس کی واپسی سفید کفن میں ہوگی۔

اب اس روئے زمین پر کون ہے جو لٹی ہوئی ماں کو اس کا بچہ لوٹائے گا۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ ایسا ہی ہو جائے کہ ماں باپ کے دل کو ذرا سا قرار آ جائے۔ یہاں آ کر ہماری بے بسی بڑے دکھ دیتی ہے۔ یہ کہنا تو بڑی بھول ہوگی کہ خود ہمارا بچہ خون میں نہلایا گیا ہوتا تو ہم قاتل کے ساتھ کون سا سلوک کرنا چاہتے۔ ماں خود کو والدین کی جگہ رکھ کر سوچیں تو ایک ہی خواہش پر اتفاق ہے۔ خواہش بھی ایسی کہ اس کے خلاف کوئی کتنی ہی دلیلیں دے۔ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور وہ یہ کہ شہر کے سب سے بڑے چوک پر پھانسی گڑی ہو اور اس بے رحم اور سفاک قاتل کے سر پر غلاف بھی نہ چڑھا ہو تاکہ وہ اپنے مرنے کا منظر خود دیکھے۔ پھر اس کے گلے میں پھندا ڈالا جائے اور مظلوم ماں سے کہا جائے کہ قاتل کے پیروں تلے تختہ کھینچے۔

پشاور شہر میں جس کا نام کبھی پشپ پور تھا، یعنی پھولوں کا شہر، اس کو اُجاڑنے کے لیے ظالموں نے پھولوں ہی کو کچلا۔ کیسے کیسے ہونہار، ذہین اور علم کی شمع سے محبت کی دعا مانگنے والے بچے ذرا سی دیر میں خاک میں ملا دیے گئے۔ ایک دکھی باپ کی یہ بات عمر بھر یاد رہے گی کہ جس کو بیس برس تک پالا تھا، ظالموں نے اسے بیس منٹ میں مار ڈالا۔ اس پٹھان باپ کی صدا گونج رہی ہے جو اپنے مخصوص لہجے میں کہے جا رہا تھا: حد ہو گئی ہے یار، خدا سے ڈرو یار، بہت ہو گیا یار، اب بس بھی کر دو یار۔

وہی معصوم چہرے آنکھوں کو نم کر رہے ہیں جنہیں پشاور میں درندگی نگل گئی۔ اداسی ٹھہر گئی ہے، پورا دیس دکھی، پورا جگ جیتا جاگتا رو رہا ہے۔ مائیں آج شب بھی ستاروں میں کہیں کھو کر اپنے اپنے چاند ڈھونڈ رہی ہیں حالانکہ ستارے خود محو تلاش ہیں کہ کتنے چاند خاک اوڑھ کے سو گئے ہیں۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے، لوگوں کے دل رو رہے ہیں، آنکھوں سے اشکوں کے سمندر رواں ہیں۔ وہ قیامت ہے کہ کوئی منظر دیکھا نہیں جاتا۔ سوگ گلیوں میں پھر رہا ہے، پتا پوچھ رہا ہے، ایسے ظالموں کا جن کا نہ مذہب سے تعلق، نہ انسانیت سے رشتہ۔

لوگوں نے شمعیں روشن کر کے موت کو بتا دیا ہے کہ ساری وحشتوں کے بعد بھی زندگی نہیں ہاری۔ پاکستانیوں نے اپنے زندہ جذبوں سے پیامِ زیست لکھ دیا ہے کہ ہم دہشت گردوں سے خائف نہیں ہیں، ہم وحشیوں سے نہیں ڈرتے، ہم ایک قوم ہیں، دشمن جو چاہے کر لے، ہم ایک رہیں گے۔

اب ہمیں ایک ہو کے عہد کرنا چاہیے کہ دہشت گردوں کا جنازہ نکال دیں گے۔ دہشت گردوں کے حامیوں کو اپنی صفوں میں جگہ نہیں دیں گے، خواہ وہ سیاست کی صف ہو یا مذہب کی صف۔ جن ماؤں نے اپنے بچوں کو صبح سویرے تیار کر کے گھر سے بھیجا تھا، ان کے دکھ کو کون سمجھ سکتا ہے جن کی شام سوگوار ہو گئی، جن کے آنگن میں پھولوں کے جنازے پڑے ہوئے تھے، جن کے پھول مسل دیئے گئے، جن کی شام غم میں ڈوب گئی۔ کچھ تو ایسے تھے جو گھروں کے اکلوتے چراغ تھے، کچھ تو ایسے تھے جن پہ محبتیں واری جاتی تھیں، بچے کسی آنگن کے بھی ہوں کسے پیارے نہیں ہوتے، پھول سے چمن کی رونق ہے۔ پھول جس گلستان کا بھی ہو، پھول سے ماحول مہکتا ہے۔ پھول سے گلشن کا پتا نہیں پوچھا کرتے۔ کیا کہا جائے جب محبتوں کو، پھولوں کو، چراغوں کو مٹی میں رکھ دیا جائے۔ اتنی محبتیں، اتنے پھول، اتنے چراغ کہ آسمان بھی اشکبار تھا۔ کل شب، دھرتی روئی تھی اپنے پھولوں کو، کلیاں ڈھونڈ رہی تھیں چراغوں کو۔

ہم تین دن کا سوگ منا کر ان زخموں کو مندمل نہیں کر سکتے جو ماؤں کے دلوں پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گئے ہیں اور ان کی گود ویران کر گئے ہیں۔ بچوں کے خون کے دھبے تو شاید کبھی نہ دھل سکیں اس لیے کہ یہ صرف فرش، فرنیچر، کپڑوں اور زمین پر موجود نہیں۔ یہ سب چیزیں صاف ہو جائیں گی مگر دل پر لگنے والے دھبے شاید کبھی نہ دھل سکیں۔

یہ دھبے ہماری ملکی سلامتی کی تاریخ پر ایک بدنما داغ کے طور پر بھی ہمیشہ موجود رہیں گے۔ اس سانحے نے کسی خاص مذہب یا ملک کی بجائے ہر انسان کا دل غم سے لبریز کیا ہے۔ ہمارے پھول سے بچوں کے سفاکانہ قتل نے تمام دُنیا کو لہو کے آنسو رُلا دیا ہے کیوں کہ یہ انسانیت کا قتل تھا، اسی لیے پوری دُنیا نے اس واقعے پر اپنے غم، غصے اور سوگ کا اظہار کیا ہے۔

پشاور کے حساس ترین علاقے میں واقع صوبے کے سب سے بڑے فوجی اسکول پر شدت پسندوں کے حملے کی خبر پوری دُنیا میں آگ کی طرح پھیلی۔ انسانوں کے بھیس میں آئے درندے اس قدر سفاک تھے کہ انہیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ معصوم بچوں پر بھی بھلا کوئی گولیاں برساتا ہے۔ حملے کی منصوبہ بندی اس قدر منظم انداز میں کی گئی تھی کہ حملہ آور مکمل طور پر آگاہ تھے کہ منگل کے روز دو اہم سرگرمیوں کی وجہ سے اسکول میں طلبا کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو گی۔ انتہائی افسوس کہ ہمارے جو فوجی جوان ضرب عضب میں لڑ رہے ہیں ان کے بچوں کی باقاعدہ شناخت کر کے زندگی سے انہیں شہید کیا گیا۔ جو معصوم ہمت اور حوصلے سے اپنے باپ کا پورا نام بتاتا کہ میں فلاں افسر کا بیٹا ہوں، بے حس ننھی منی جانوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے سروں پر گولیاں مارتے رہے۔

ہماری بہادر قوم اس حملے پر غمناک اور رنجیدہ ضرور ہے مگر اس کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ وہ دہشت گردوں کو بتا دینا چاہتی ہے کہ اس طرح کی کارروائیوں سے تم ہمیں شکست نہیں دے سکتے۔ ہمارا عزم ابھی بھی جواں ہے اور ہم تم جیسے بزدلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی بہادر افواج کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ ہم کل بھی متحد تھے اور آج بھی ہم اس دھرتی کو فساد کے خاروں سے پاک کرنے کے لیے پُرعزم ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ علم کے متلاشی ان شہید معصوموں کی روحوں کو سکون اور اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر کرنے کی عظیم توفیق دے۔ آمین!

بچے

سانحہ پشاور کے بچوں کی یاد میں

ہم سب کی پہچان ہیں بچے
خوشیوں کا سامان ہیں بچے
ہر آنگن ہر گھر کی رونق
ہر دل کا ارمان ہیں بچے
اللہ کی مخلوق کے اُوپر
اللہ کا احسان ہیں بچے
نازک نازک کومل کومل
گل بوٹے گل دان ہیں بچے
بچوں والے یہ کہتے ہیں
جسم ہیں بچے جان ہیں بچے
آج کی ننھی منی دُنیا
کل کا پاکستان ہیں بچے

کرامت بخاری

چکن پاکس

چکن پاکس، جسے آبلہ یا کاکڑہ بھی کہتے ہیں، ایک عام بیماری ہے جو پورے جسم پر سرخ دھبوں اور جلن کا سبب بنتی ہے۔ یہ بچوں میں زیادہ عام ہے لیکن ہر اس شخص کو جس نے چکن پاکس ویکسین نہ لے رکھی ہو، زندگی میں ایک مرتبہ ضرور ہوتی ہے۔ پاکستان کے دیہی علاقوں کے ساتھ ساتھ شہری علاقوں میں بھی جہاں ویکسین دستیاب نہیں، یہ وبا تیزی سے ایک بچے سے دوسرے بچے میں منتقل ہو رہی ہے۔

چکن پاکس بطور خاص ان بچوں کو ہوتی ہے جن کا مدافعتی نظام (Immun System) درست کام نہ کر رہا ہو۔ چکن پاکس سے متاثرہ بچوں کو دوسرے بچوں سے دُور رکھنا چاہیے۔ جو بچے شروع ہی سے صحت مند ہوتے ہیں، ان کے لیے اگرچہ یہ بیماری سنجیدہ نہیں لیکن پھر بھی ان بچوں کو اس وقت تک اسکول نہ بھیجیں جب تک وہ مکمل طور پر اس بیماری سے جان نہ چھڑا لیں۔ لہٰذا ان بچوں کو گھر میں آرام کرنا چاہیے۔ چکن پاکس ختم ہونے کے باوجود بھی اس کے وائرس جسم میں موجود رہتے ہیں۔ اگر یہ دوبارہ سرگرم (active) ہو جائیں تو چکن پاکس سے زیادہ تکلیف دہ تعدیہ کی وجہ بن سکتے ہیں، جسے شنگلز کہا جاتا ہے۔ چکن پاکس چھینکنے اور کھانے پینے کی اشیاء سے ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس بیماری کی علامات جلن اور خارش ہوتی ہے۔ بخار، سر درد، کمزوری کا احساس، بھوک نہ لگنا، تھکن کا مسلسل احساس رہنا اور گلا خراب رہتا ہے۔ اس کی علامات ظاہر ہونے میں 14 سے 16 دن لگتے ہیں۔ جلد پر سرخ دھبے نمودار ہونے کے بعد 5 سے 7 دن تک روزانہ نئے نشان ظاہر ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں مستند ڈاکٹر کو ضرور دکھانا چاہیے۔ گھریلو علاج میں اجوائن اور نیم کے پتوں کی دھونی دینی چاہیے۔ چکن پاکس کے لیے ویکسین کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ویکسین کی دو خوراکیں لینا ضروری ہے۔

متاثرہ بچوں کو پانی یا مشروب زیادہ سے زیادہ پلائیں تاکہ جسم میں پانی کی کمی کو روکا جا سکے اور بخار کی شدت کم ہو۔ متاثرہ بچے کو ٹھنڈے پانی سے ہرگز نہ نہلائیں کیوں کہ جسم زیادہ ٹھنڈا ہو گا تو خون کی نالیاں سکڑ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے بخار کی تپش باہر نکلنے کے بجائے ہڈیوں کو متاثر کرتی ہے۔ متاثرہ بچے کو ٹھنڈی ہوا سے دُور رکھیں، البتہ کھڑکیاں کھول کر تازہ ہوا کا استعمال متاثرین کے لیے بہتر ہے۔ متاثرہ بچے کے ناخن تراشتے رہیں تاکہ وہ متاثرہ مقامات کو کھجا نہ سکے کیوں کہ کھجانے سے سرخ دھبے زیادہ تیزی سے پھیلتے ہیں۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 فروری 2015ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 فروری 2015ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

فروری کا موضوع "لائبریری" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 فروری 2015ء ہے۔

نام ________ عمر ________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ________ شہر ________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

مَالِکُ الْمُلْک جَلَّ جَلَالُہٗ (سلطنت کا مالک)

ہر چیز کے مالک ہیں، وہ تمام بادشاہوں کے بادشاہ ہیں، ساری بادشاہت اُن ہی کی ہے۔

ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں: ''یہ ملک میرا ہے، میں اس کا بادشاہ ہوں۔'' پھر کچھ سالوں بعد کوئی دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اور پھر وہ بھی اسی طرح کے گن گانے لگتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں: ''میں اس ادارے کا سربراہ ہوں، بڑا ہوں۔'' پھر کچھ سالوں بعد اس کی جگہ کوئی دوسرا آجاتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں: ''یہ دکان میری ہے'' مگر پھر کچھ سالوں بعد اس کی جگہ بیٹا آجاتا ہے اور باپ کا نام و نشان نہیں رہتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں بڑا ہوں...... بادشاہ ہوں...... سربراہ ہوں...... ان کے مرتے ہی ان کی بادشاہت اور سربراہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے، مگر ایک ذات ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی اور وہ ہے اللہ تعالیٰ۔

اس کا نام مَالِکُ الْمُلْکِ جَلَّ جَلَالُہٗ ہے۔ وہ ہر سلطنت کا بادشاہ ہے۔ وہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری کائنات کا مالک اور بادشاہ ہے۔ وہ جسے چاہے فقیر سے بادشاہ بنا دے اور جسے چاہے بادشاہ سے فقیر کر دے۔

خندق کے موقع پر

حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے خلاف سارے کافر جمع ہو چکے تھے۔ یہودی، نصرانی اور عرب کے سارے مشرکین نے مل کر مدینے شریف پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا تاکہ سارے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ کافروں کا لشکر بہت بڑا تھا۔

آپ ﷺ نے اپنے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ فرمایا۔ مشورے میں یہ طے ہوا کہ مدینے پاک کے چاروں طرف خندق کھود لی جائے۔ یہ خندقیں کئی میل لمبی اور اچھی خاصی گہری کھودی گئیں تاکہ کافروں کا لشکر خندق کی صورت میں بڑے بڑے لمبے اور گہرے گڑھوں کو عبور ہی نہ کر سکے۔ وقت بہت تھوڑا تھا اور کام بہت زیادہ۔

آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے بہادر سپاہی اس کام میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں کھانے اور پینے تک کا ہوش نہ تھا۔

تقریباً سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھوکے تھے اور حضور ﷺ کے پیٹ مبارک پر بھی بھوک کی وجہ سے پتھر بندھے

ہوئے تھے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ایمان کی طاقت تھی، اس لیے کھدائی کا سارا کام جلد سے جلد پورا ہو رہا تھا۔ خندق کھودتے کھودتے ایک جگہ پتھر کی بڑی چٹان نکل آئی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے پورا زور لگا لیا، مگر وہ پتھر ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا گیا اور ساری صورت حال بتائی گئی۔

آپ ﷺ اس جگہ تشریف لائے اور اپنے مبارک ہاتھ سے کدال لگائی تو اس چٹان کے ٹکڑے ہو گئے اور ایک آگ کا شعلہ برآمد ہوا جس سے دُور تک اس کی روشنی پھیلی۔ اس روشنی کو دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس روشنی میں ملک فارس کے محلات اور عمارتیں دکھائی گئیں۔''

پھر آں حضرت ﷺ نے دوسری ضرب لگائی اور پھر آگ کا شعلہ ظاہر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس روشنی میں مجھے ملکِ روم کے سرخ محلات اور عمارتیں دکھائی گئیں۔'' پھر تیسری ضرب لگائی اس کی بھی روشنی پھیلی اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس میں مجھے یمن کے بڑے بڑے محل دکھائے گئے۔'' پھر فرمایا: ''میں تمہیں خوش خبری دیتا ہوں، مجھے جبرئیلِ امین نے خبر دی کہ میری اُمت ان تمام ممالک کو فتح کرے گی۔''

جب یہ خبر مدینے کے غداروں اور کافروں تک پہنچی تو انہوں نے بہت مذاق اُڑایا کہ دیکھو جی! جان بچانے کے ڈر سے خندق کھود رہے ہیں۔ کھانے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں ہے اور یہ خواب دیکھ رہے ہیں اتنے بڑے بڑے ملکوں کو فتح کرنے کے۔

اللہ تعالیٰ نے پھر ان کافروں کے ہنسنے پر یہ آیت نازل فرمائی جس میں مَالِکَ الْمُلْکِ جلّ جلالہٗ نے اپنا نام بھی ذکر فرمایا۔

ترجمہ: ''کہو، اے اللہ! اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے رسوا کر دیتا ہے، تمام تر بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔''

اس کے بعد دُنیا نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ملک فارس، ملکِ روم اور ملکِ یمن کے بڑے بڑے محل اور عمارتیں فتح کیں۔ اس وقت کے فقیر اس وقت کے بادشاہ بنا دیئے گئے۔

دعا قبول کروایئے

جو شخص یہ آیت پڑھ کر دعا کرے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول ہوگی۔

آیت یہ ہے:

''قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ''

ترجمہ: کہو کہ: اے اللہ! اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے۔''

یاد رکھنے کی باتیں

1- جو چیزیں ہم استعمال کرتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں لیکن یہ سب چیزیں وقتی ہیں۔ ان کا صحیح استعمال ہمارے لیے ضروری ہے۔ کسی چیز کو فضول ضائع کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔

2- کسی نے کوئی چیز چھین لی، مثلاً پنسل چھین لی۔ کوئی پنسل واپس نہ کرے تو واپسی کا مطالبہ نرمی سے کیا جائے۔ اگر کوئی نہیں دیتا تو جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ دُنیا کی چیزوں کی خاطر مسلمان نہیں لڑتے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ قسمت میں ہوئی تو مل جائے گی۔

مقامِ محمود

یہ عبودیت کا ایک ایسا ارفع و اعلیٰ مقام ہے، جس پر اللہ تعالیٰ (اپنے قانونِ انعام و فضل کی رُو سے) اپنے کسی بندے کو فائز کر دیتا ہے تو لوگ اس کے مکارمِ اخلاق، علم و حکمت اور زہد و تقویٰ کی تعریف میں رطب اللساں ہو جاتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہیں:

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا○ (الاسراء، 17: 79):

(پیارے نبیؐ!) آپ کا پروردگار آقا عنقریب آپ کو ایسے حسین و مکرم مقام پر متمکن کر دے گا کہ آپ کی مدح و ستائش ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

چنانچہ گزشتہ چودہ صدیوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل تعریف و ستائش ہو رہی ہے، جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، اور یہ تاریخی واقعیت قرآنِ حکیم کی الہامی پیش گوئی کی برہان قاطع ہے۔

☆☆☆

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر تو مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے
(حرا ظفر، گوجرانوالہ)

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا
(اقصیٰ سجاد، راولپنڈی)

محمدؐ نہ ہوتے خدائی نہ ہوتی
خدا نے یہ دُنیا بنائی نہ ہوتی
(ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں، اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟
(حارث طاہر، راٹھور)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
(محمد احمد غوری، بہاولپور)

عجب رسم ہے چارہ گروں کی محفل میں
لگا کر زخم نمک سے مساج کرتے ہیں
(مریم صدیقہ، گوجرانوالہ)

گلشن میں پھروں کہ صحرا دیکھوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
(علینہ احمد، راولپنڈی)

عمر بھر کی ریاضت کا لہو لگتا ہے
اتنا آساں نہیں قاری قرآں ہونا
☆

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا
(ریحان، ابرار الحق، راجہ جنگ)

صبح کو باغ میں شبنم گرتی فقط اس لیے
کہ پتا پتا کرے تیرا ذکر باوضو ہو کر
☆

میرے بچپن کے دن کتنے اچھے تھے اقبال
بے نمازی بھی تھا اور بے گناہ بھی
(محمد مبشر، کوہاٹ)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
(ہاجرہ ابراہیم ورک، راولپنڈی)

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے
(الطاف لطف، کانگڑہ)

تیرے صوفے ہیں افرنگی، تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی!
☆

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
(نفسہ فاطمہ)

پھیلا ہے اتنا حسن کہ اس کائنات میں
انساں کو بار بار جنم لینا چاہیے
(خدیجہ عابد، جھنگ صدر)

کچھ اہلِ گلستاں نے مجھے بخشے ہیں کانٹے
کچھ مجھ کو الجھ جانے کی عادت بھی بہت ہے
(محمد حمزہ سعید، بورے والا)

کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی
(محمد کاشف، لاہور)

اسلامی درس گاہیں

اسلامی درس گاہوں نے محدث، علماء، حکیم اور سائنس دان پیدا کیے کیوں کہ ان درس گاہوں میں قرآن، احادیث، فقہ، عربی زبان، شاعری، حساب، جغرافیہ، طب اور ادب و انشا، غرض بے شمار علوم و فنون پر توجہ دی جاتی۔ ان درس گاہوں سے فارغ التحصیل طلباء نے اپنی اپنی درس گاہیں کھول کر درس گاہوں میں اضافہ کیا اور ان طلباء نے دین، تاریخ، سائنس، جغرافیہ اور حکمت میں ایسا کردار ادا کیا کہ دنیا کی دیگر اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا۔ کاغذ کے کارخانوں کی وجہ سے علم کو کتب کی صورت میں پڑھایا جانے لگا۔ اس وقت اشاعت خانوں کا بھی وجود تھا جس کی وجہ سے اسلامی درس گاہوں کے علوم اسلامی سلطنت سے باہر بھی جانے لگے۔

علماء اور درس گاہیں: علماء اور محدثین عوام کے لیے کتاب اور درس گاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

امام مالک: اگر علماء اور محدثین کا ذکر کیا جائے تو امام مالک کی درس گاہ سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ آپ کی درس گاہ میں ایک کاتب حبیب نامی شخص تھا۔ وہ طلباء کی جماعت کے سامنے ان کی کتب کو پڑھتا تھا۔

امام بخاری: امام بخاری نے دس سال کی عمر میں علم و حدیث کے لیے بخارا کی ایک درس گاہ میں داخلہ لیا تھا۔ امام بخاری کے زمانے میں ایک محدث داخلی تھے۔ آپ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک دن محدث داخلی کی زبان سے یہ سند نکلی۔ سفیان عن ابی زبیر عن ابراہیم۔ تو امام بخاری نے انہیں فوراً ٹوکا اور استاد کی سند کی غلطی بتائی۔ داخلی محدث نے انہیں جھڑک دیا مگر جب محدث داخلی نے اصل کتاب دیکھی تو واقعی سند اسی طرح تھی جس طرح امام بخاری نے بتائی تھی۔ آپ کا حافظہ بہت تیز تھا۔ تمام طلباء درس گاہ میں لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ ساتھ لاتے مگر امام صاحب بالکل نہ لکھتے تھے کیوں کہ آپ ذہن میں حفظ کر لیتے۔

امام مسلم (متوفی رجب 261ھ): امام مسلم نے ابتدائی تعلیم نیشاپور سے حاصل کی۔ آپ نے تعلیم محمد بن یحییٰ نیشاپوری اور یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری کی درس گاہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد امام بخاری کے حلقۂ درس میں آ گئے۔

بیولانی: مدینہ منورہ میں بیولانی کی درس گاہ بہت مشہور تھی جہاں سے مالکؒ، امام اوزاعی اور یحییٰ بن سعید فیض یاب ہوئے۔

ضحاک بن زاہم: کوفہ میں ضحاک نے ایک ابتدائی درس گاہ قائم کر رکھی تھی جہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

امام نووی: امام نووی کے والد انہیں دمشق لے کر آئے تھے جو علماء اور علوم کا مرکز و محور تھا۔ وہاں مدارس میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی جو تعداد میں 300 کے قریب تھے۔ امام نووی نے مدرسہ رواحیہ میں تعلیم حاصل کی۔ یہ درس گاہ جامع اموی سے متصل تھی۔ اس کا بانی ایک تاجر ذکی الدین ابو القاسم تھا، اس میں جید علماء درس و تدریس دیتے تھے۔

محمد بن موسیٰ الدمیری: محمد بن موسیٰ کی ولادت 750ھ کے قریب قاہرہ میں ہوئی۔ الدمیری نے القبۃ العبیریسیہ میں درسِ حدیث دیا۔ اس طرح مدرسہ ابن البقری باب النصر اور جامع ظاہر حسینیہ میں بروز جمعہ وعظ و نصیحت اور تذکیر کیا کرتے تھے۔

عبداللہ بن ذکوان، محمد بن عجلان اور عمر فاروقؓ کے غلام اسلم کی کی مشہور درس گاہیں تھیں۔ جہاں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، امام شعبی، مسعر بن کدام کی درس گاہیں نہایت مشہور تھیں۔

امام ابن تیمیہ: امام ابن تیمیہ نے نہایت کم عمری میں مدرس کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جس وقت آپ نے درس و تدریس کا کام سنبھالا، آپ کی عمر 21 سال تھی۔

امام غزالی: امام غزالی نیشاپور کے مدرسہ نظامی کے اعلیٰ امام الحرمین عبدالملک جوینی کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام تک ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ امام غزالی نظامیہ بغداد میں مدرس اعلیٰ بھی رہے۔

علامہ ابن خلدون: علامہ ابن خلدون نے حج بیت اللہ کے بعد مصر کا سفر کیا اور وہاں کی مشہور علمی درس گاہ جامع الازہر میں بطور استاد کام کرتے رہے۔

خالد بن معدان: خالد کی مشہور درس گاہ حمص میں تھی۔ علماء نے اپنی علمی ہنر کے باعث مختلف خدمات انجام دیں اور بہت علماء جو درس گاہوں سے پڑھے لکھے مشہور شخصیات میں شمار ہوئے مثلاً مصر کے قاضی یزید بن ابی حبیب معلم کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے اور حکمران بھی علماء کی تعریف کرتے۔ اموی حکمران اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کی غرض سے پہلے صحرا میں بھیجتے اور عربی زبان میں مہارت دلواتے۔ ان کے بعد علماء کی صحبت میں بھیجتے۔ اموی حکمرانوں کے بچے تاریخ، حساب، جغرافیہ، صرف و نحو اور کیمیا سیکھتے۔ عبدالملک نے اموی بچوں کے لیے اتالیقی کا سلسلہ شروع کیا۔ دین کی تعلیم ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے مسلمان علماء و مبلغین جہاں بھی گئے، وہاں علماء کے دینی علوم پر تحقیق و اشاعت کی درس گاہیں کھلتی گئیں۔ اس ضمن میں مسلمان حکمرانوں نے بھی ہر دور میں علماء کے ساتھ تعاون کیا۔

برصغیر میں قدیم درس گاہیں: امام ابو محمد کا مدرسہ 375ھ میں منصورہ میں قائم ہوا تھا۔ برصغیر میں اسلامی تعلیم اسلام کے ابتدائی دور سے ہی آ گئی تھی اور یہاں سے کئی محدث بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام کی تعلیم کو فروغ دیا۔ محدث رجا سندھی جو 321ھ میں ہندوستان سے ایران گئے، امام حاکم نے ان کو رکن من ارکان الحدیث لکھا ہے۔ قاضی ابو سعید عبدالکریم سمعانی (م 522ھ) تحصیل علم کے لیے لاہور آ گئے تھے۔ ان چند ناموں کے لیے تو جگہ درکار تھی مگر برصغیر میں بے شمار اسلامی درس گاہوں کا تذکرہ بہت وسیع ہے جو زمانہ قدیم میں تھیں۔

سلطان محمود غزنوی اور درس گاہیں: بنو امیہ اور عباسیوں کی طرح سلطان محمود غزنوی نے بھی درس گاہوں اور علوم کی طرف توجہ دی۔ اس نے ایسے مدرسے کھولے جہاں مفت تعلیم اور وظائف بھی مقرر تھے۔ زمانہ قدیم میں اسلامی سلطنت میں دینی تعلیم کی جامعات اور سائنسی تعلیم کی جامعات سے فارغ التحصیل طلبہ نے دینی اور سائنسی علوم پر بے شمار مسلمانوں نے کام کیا۔ مسلمانوں نے اتنے زیادہ تعلیمی ادارے کیوں بنائے کیوں کہ اس دور کی دیگر اقوام کے مقابلے میں تعلیم کا شوق مسلمانوں کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ صرف قرطبہ شہر میں عبدالرحمٰن ثالث کے دور میں 70 لائبریریاں تھیں اور مسلمان حاسد قوم نہ تھی۔ علم پر کوئی پابندی بھی نہ تھی اور اس ضمن میں یورپی اقوام نے بھی مسلمان قوم کے علوم و تجربات سے فائدہ اُٹھایا۔

زمانہ قدیم کی اسلامی درس گاہوں کی امتیازی خصوصیات:

زمانہ قدیم کی اسلامی درس گاہوں میں طلبہ کو تمام سہولیات میسر ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں عورتیں بھی علوم کے زیور سے آراستہ تھیں۔ غریب و امیر طلبہ کا فرق تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ جہاں اسلامی درس گاہیں سہولیات سے آراستہ تھیں، وہیں کھیل کے میدان اور کھلی فضا بھی میسر تھی۔

بغداد، بصرہ، قیروان، قرطبہ اور نیشاپور کے علاوہ کئی شہروں میں وسیع و عریض مدارس تھے جہاں سے تاجروں، سیاحوں، حکیموں، سائنس دانوں، معماروں اور علماء نے پوری دنیا پر دھاک بٹھا دی۔

آج بھی ان کے علوم، ایجادات اور فنِ تعمیر کو اقوامِ عالم مثال گردانتے ہیں اور دیگر اقوام ان سے حسد کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے برعکس تاتاریوں اور دیگر اقوام نے تو درس گاہوں کو تباہ کیا اور کتب کو جلایا مگر مسلمانوں نے اس کے برعکس عمل کیا۔ نصیر الدین محقق طوسی ہلاکو خان کا وزیر تھا۔ اس نے ہلاکو کو رصدگاہ بنانے پر آمادہ کیا تھا۔ پھر اس میں ہیئت دانوں کو کثیر تنخواہوں پر اکٹھا کیا۔ اس رصدگاہ کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی بنایا گیا اور اس میں بچی کھچی کتب جمع کیں۔

سائنسی درس گاہیں: اسلامی سائنسی درس گاہوں نے یونانی، فارسی، رومی، سائنسی درس گاہوں کے برعکس پوری دُنیا میں اپنا لوہا منوایا کہ سائنسی علوم میں دُنیا کی اقوام اسلامی سائنسی درس گاہوں کے علوم کی پیروی کرنے لگے۔ عمر بن عبدالعزیز نے انطاکیہ اور حران میں میڈیکل اسکول قائم کیے۔ عباسی دور میں علم نباتات پر تحقیق کے لیے بہت سے باغات لگوائے گے جہاں بے شمار درخت و پودے کاشت کیے جاتے اور سائنس دان ان میں تجربات کرتے تھے۔ کوئی شخص جب تک طب کا امتحان پاس نہیں کر لیتا تھا اور سند حاصل نہ کر لیتا وہ شخص طب و دوا سازی کا پیشہ اختیار نہ کر سکتا تھا۔ جندی شاپور میں قدرتی سائنس کا مشہور کالج عباسی دور میں بنا تھا۔ اس کالج نے صنعت و حرفت کی ترقی میں بھی کردار ادا کیا۔ چینی صاف کرنے کا طریقہ اسی سائنسی ادارے کے ذریعے لگایا گیا۔

سائنس دان درس گاہوں میں: بے شمار علماء، جغرافیہ دان، زبان دان، سائنس دان جنھوں نے دُنیا میں اپنے علمی کارنامے انجام دیئے، یہ سب یونی ورسٹیوں سے پڑھے لکھے تھے۔ بے شمار سائنس دان درس گاہوں سے پڑھے لکھے۔ مثلاً:

ابو القاسم الزاہراوی: الزاہراوی نے طب و علوم حکمت کی تعلیم قرطبہ یونی ورسٹی کے علماء و فضلا سے حاصل کی۔ بہترین شفاء خانوں سے تربیت پائی۔

ابن رشد: ابن رشد کا دادا محمد بن رشد قرطبہ کا قاضی اور مفتی تھا۔ اس کے فتاویٰ کا مجموعہ پیرس کے شاہی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ابن رشد کا باپ احمد بن رشد بھی قرطبہ کا قاضی تھا۔ ابن رشد نے اپنے والد سے تعلیم پائی۔ ابو جعفر ہارون سے بھی تعلیم پائی اور طب کے رموز سیکھے۔

البیرونی: البیرونی، خوارزم کے حکمران کے چچا زاد بھائی ابو نصر منصور کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا جو کہ ریاضی ہیئت کا ماہر تھا۔ اس لیے ابو نصر البیرونی کی درس گاہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد 1000 عیسوی میں البیرونی نے آثار الباقیہ لکھی اور 1007 عیسوی میں رصدگاہ کے اندر مشاہدہ افلاک شروع کر دیا۔

رازی: رازی سائنس دان بغداد (عراق) میں علی بن سہل کے حلقۂ درس میں شامل ہوا اور علی بن سہل کی شاگردی اختیار کی۔

مسلمان ماہرین معاشیات درس گاہوں میں:

ابو عبید القاسم: ابو عبید القاسم کی پہلی درس گاہ اس کا اپنے باپ سے پہلا سبق سیکھنا تھا۔ اس کے بعد آپ بصرہ اور کوفہ گئے۔ قیام بغداد کے بعد آپ نیشاپور میں اپنے علمی محسن عبداللہ کے پاس گئے۔ زندگی کے آخری ایام میں تصنیف و تالیف شروع کی۔

علامہ ابن حزم: علامہ ابن حزم کے سن شعور کو پہنچتے ہی ان کے والد نے مشہور ترین عالم عبدالرحمٰن کو ان کا استاد مقرر کیا۔ اس کے بعد علامہ ابن حزم نے محدث ہمدانی سے سماعت حدیث کا درس لیا۔ اس کے بعد علامہ ابن حزم نے مریہ کے علاقے میں درس و تدریس پر وقت خرچ کیا۔

شاعر عمر خیام کی درس گاہ میں تربیت: عمر خیام نے استاد موفق سے ان کی درس گاہ پر تربیت حاصل کی۔

شاہ سلجوقی کے وزیراعظم کا درس گاہوں کی تعمیر میں کردار: نظام الملک طوسی جو سلجوقی شاہ کا وزیراعظم تھا، کئی اہم درس گاہیں تعمیر کیں۔ اس نے قابل ترین علماء جمع کیے۔ شام، خراسان اور عراق میں بہت سی اعلیٰ درس گاہیں قائم کیں۔ 1066ء میں نیشاپور کی عظیم یونیورسٹی قائم ہوئی۔ نیشاپور یونیورسٹی کے صرف ایک لیکچر ہال میں پانچ سو دواتیں تھیں۔ نظام الملک کی وجہ سے خراسان کے بڑے شہروں مثلاً بلخ، ہرات اور مرو میں یونیورسٹیاں بنیں۔

نظامیہ یونیورسٹی بغداد: نظام الملک طوسی نے 1065-67 عیسوی میں بغداد میں نظامیہ یونیورسٹی بنائی۔ اس یونیورسٹی میں بہت سے علاقوں سے طلباء تعلیم حاصل کرنے آتے اور اساتذہ کی تنخواہیں بہت معقول تھیں۔ طلبہ سے فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ اکثر کو کتب اور کھانا مفت ملتا۔ اس وجہ سے غریب طلباء یہاں تعلیم حاصل کرنے سے محروم نہ رہے۔

نظام الملک طوسی کا یونیورسٹیز چلانے میں کردار:

نظام الملک کے دور میں کل آمدنی کا دسواں حصہ تعلیم پر لگایا جاتا تھا۔ تمام درس گاہوں پر تقریباً تیس لاکھ روپے لگے تھے۔ نظامیہ

یونیورسٹی آف بغداد پر دس لاکھ کے قریب لاگت آئی تھی۔ ہر سال ایک لاکھ روپے نظامیہ یونیورسٹی آف بغداد کو ملتے۔ یہ درس گاہ تقریباً 200 سال تک چلتی رہی۔ اس یونیورسٹی میں کتابوں کا عظیم ذخیرہ تھا۔

مسلمان موسیقار: اسلامی سلطنت میں موسیقار اموی اور عباسی دور سے بننا شروع ہوئے۔ بالعموم طور پر موسیقی کے لحاظ سے مسلمان قوم کو دیگر اقوام کا پیروکار سمجھا جاتا ہے مگر یہ سراسر غلط ہے۔ مسلمان قوم غزل و موسیقی، نغمے میں کسی کی محتاج نہیں تھی۔ بعض اموی اور عباسی خلفاء موسیقی کا بڑا صاف ستھرا ذوق رکھتے۔ موسیقاروں کو انعام ملتے۔ اس ضمن میں حیران کن چیز یہ ہے کہ موسیقی کے باقاعدہ اسکول قائم تھے۔ غلاموں اور لونڈیوں کو باقاعدہ اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بغداد اور دمشق موسیقی کے بڑے مراکز تھے۔ درباروں میں مغنیے ہوتے تھے۔ اس دور کا مشہور موسیقار موصلی تھا اور موصلی کا بیٹا موسیقی کا امام مانا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے موسیقی کے نئے گیت، دھنیں اور راگ دریافت کیے۔ ایک عورت بزل (Buzal) نے سات ہزار نئے راگ تحریر کیے۔ عریب نے ایک ہزار کے قریب راگ ایجاد کیے۔

کتاب الاغانی کے مصنف نے شہزادی عالیہ کے راگوں کی بہت تعریف کی۔ اسکندری، فارابی، بوعلی سینا موسیقی کے مسلمان سائنس دان اور مصنف تھے۔ یہ سب کمال زمانۂ قدیم کی اسلامی سلطنت کی درس گاہوں اور یونی ورسٹیوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔

جغرافیہ دان: مسلمان چوں کہ پڑھے لکھے تھے اس وجہ سے وہ نقشے بنا کر سمندروں اور پہاڑوں کے راستے سیر و تفریح کرتے اور وہاں کے موسمی و جغرافیائی حالات لکھتے۔ ان جغرافیہ دانوں کی درس گاہ زمین کو سر کرنا تھی جہاں وہ زمین اور سمندروں میں مشاہدہ کرتے اور سیکھتے، پھر ساری چیزیں قلم بند کرتے۔ مثلاً ابن فضلان، عباسی دور کا مشہور دانش ور تھا۔ وہ روس میں عباسیوں کا سفیر تھا۔ ابن فضلان نے روسی علاقوں کی آب و ہوا، موسمی حالات، انسانی مزاج، خوراک حتیٰ کہ سائبیریا کے ٹھنڈے علاقوں، جانوروں اور معدنیات کے بارے میں چیزیں نوٹ کر کے تحریر کیں۔

ادریسی (جغرافیہ دان) نے پوری دُنیا کا نقشہ بنایا تھا اور سمندروں، نہروں، دریاؤں، جنگلوں اور پہاڑوں کے نشانات بھی اپنی کتاب پر بنائے تھے۔ غرض یہ کہ مسلمانوں نے ساری زمین اور اس پر موجود چیزوں سے سیکھا، مثلاً زمین کی سیر جغرافیہ دانوں کی درس گاہ، جنگلات حکیموں کی درس گاہ ثابت ہوئے۔

بریفالٹ اپنی کتاب "Making of Humanity" میں لکھتا ہے: ''اگرچہ یورپی تاریخ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر مسلمانوں کی کوششوں کے اثرات نہ ہوں لیکن سائنس اور سائنسی طریق جو کہ یورپی تہذیب کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کے ذمہ دار ہیں، مسلمانوں کا ہی دیا ہوا خزینہ ہے۔''

700 عیسوی کے قریب اموی دور میں دمشق کے اندر سائنسی رصدگاہ بنی۔ پھر اس کے بعد بے شمار رصدگاہوں اور سائنسی اداروں کی تعمیرات ہوئیں۔ بریفالٹ مزید لکھتا ہے۔ ''سائنس کی ابتداء عرب تہذیب سے ہوئی، اس سے پہلے دُنیا سائنس سے ناآشنا تھی۔''

مسلمان تعلیم میں زوال پذیر کیوں ہو گئے:

دراصل یہ مسلمانوں کی بے اتفاقی کا نتیجہ تھا۔ اسلام سے دور ہونے اور اغیار کی رسوم کی پیروی کرنے اور فرقہ واریت میں پڑنے کی وجہ سے مسلمان تعلیم میں زوال پذیر ہو گئے۔ اسلامی سلطنت کے کئی حصے ہو چکے تھے۔ اسپین ایک آزاد اسلامی ریاست بن گئی تھی، یورپیوں نے مسلمانوں سے اسپین چھین لیا۔ تاتاریوں کے حملے ہوئے۔ برصغیر، عراق اور فلسطین و مصر پر رومی و تاتاری اقوام حملہ کرتی رہیں اور مسلمانوں کو تباہ کرتی رہیں۔ وہ اپنی مدد آپ کے تحت لڑتے۔ مسلمان ایک دوسرے مسلمان کی مدد نہ کرتے جیسا کہ سقوطِ اندلس میں پیش آیا۔ سقوطِ غرناطہ میں نہایت بے دردی سے اسلامی کتب تباہ کی گئیں مگر کچھ کتب بچا بھی لی گئیں اور پھر مراکش کے ایک علم ذوق آدمی نے ان کتب کو منگوایا جو تین جہازوں پر لائی گئیں اور اس کو ریال نامی ایک محل میں رکھوایا گیا جو میڈرڈ سے 25 میل کے فاصلے پر تھا۔ آج بھی ان میں سے 1850 باقی رہ گئیں جو آج تک موجود ہیں۔ ہمایوں حکمران نے تو جلاوطنی میں بھی اپنی نادر کتب کا ذخیرہ 53 اونٹوں پر لاد کر رکھا تھا۔

نواب ضیاء الدین نیر درخشاں کا کتب خانہ جو جنگِ آزادی کے شعلوں کی نذر ہو گیا تھا، اس کے آگ بھڑکنے سے پہلے اس کتب خانے سے کتابیں مستعار لے کر اور نواب کی مدد سے ''ہنری ایلیٹ'' نے سات آٹھ جلدوں میں ہندوستان کی تمام تاریخوں کا نچوڑ پیش کیا۔ علامہ ابن حزم کی 400 کتب میں سے زیادہ تر ''اشبیلیہ'' میں سپردِ آگ کر دی گئی تھیں۔

☆☆☆

ط	ج	ش	ع	ر	ا	ب	خ	ا	ل
د	م	ے	پ	ن	م	گ	ڈ	ص	ف
ص	ا	د	و	آ	ت	ج	ژ	ن	ا
غ	ع	ز	ٹ	ق	ر	ہ	ذ	غ	س
س	ت	ظ	س	ء	ح	ک	غ	و	ت
ف	ک	ا	چ	د	ث	ط	ا	ذ	ا
ط	ڑ	ض	ط	ی	ذ	ل	ک	ض	د
ڑ	چ	ع	ش	و	ر	ج	س	ٹ	ر
ڈ	ی	س	ک	ا	ن	ق	ہ	چ	م
گ	ض	م	ء	ر	و	ی	ت	خ	ت

آپ نے حروف ملا کر دس چیزوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

دوات، کاغذ، چاک، تختی، اخبار، دیوار، جماعت، رجسٹر، استاد، ڈیسک

نعمان نے عصر کی نماز پڑھ کر قرآن پاک پڑھا، پھر گھڑی دیکھی۔ ابھی افطاری میں کافی وقت تھا، سو وہ لیپ ٹاپ آن کر کے فیس بک دیکھنے لگا۔ اچانک وہ ایک تصویر دیکھ کر ساکت رہ گیا۔

"اوہ خدایا!" اس کی آنکھیں حیرت اور دکھ سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ آگے دیکھا تو اگلی تصویر میں مزید بربریت کا مظاہرہ تھا۔

"یہ کیا ہوگیا؟" وہ فلسطین کے بچوں کی تصاویر تھیں جنہیں اسرائیلی فوجیوں نے بمباری کر کے شہید کر دیا تھا۔ کٹے پھٹے اعضا اور لہولہان جسم!!! "انسان اتنا ظالم بھی ہوسکتا ہے؟" اس نے سوچا۔ ان بچوں نے دشمنوں کا کیا بگاڑا تھا۔ اس نے فوراً ان تصویروں کو شیئر کیا اور فون پر اپنے دوستوں کو بھی تاکید کی کہ ابھی فیس بک کھولیں۔

"بھائی، امی جی کہہ رہی ہیں کہ..." اس کا چھوٹا بھائی عثمان کچھ کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا مگر لیپ ٹاپ کی سکرین پر نظر آتی تصویر دیکھ کر گویا بولنا اور پلک جھپکنا بھول گیا۔

"یہ کیا؟" وہ مزید قریب ہوا۔

"اسرائیل نے فلسطین پر بمباری کی ہے، یہ شہید بچوں کی تصویریں ہیں۔" نعمان نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی یہ تو بہت چھوٹے ہیں۔" عثمان رو پڑا۔ نعمان نے اسے گلے لگا لیا۔ "رومت، ان کے لیے دعا کرو۔ یہ کام تو ہم کر سکتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد وہ دونوں افطاری کے لیے دسترخوان پر بیٹھے تو تب بھی عثمان کی آنکھیں نم تھیں۔ ابو جان کے استفسار پر اس نے رونے کی وجہ بتائی۔ "ہاں بیٹے!" وہ افسردگی سے بولے۔ "فلسطینیوں پر بڑی آزمائش آن پڑی ہے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔"

"ابو جی، فلسطین میں کیا ہوا ہے؟" حرا نے پوچھا۔

"بیٹا! ان کے دشمن اسرائیل نے ان پر بموں سے حملہ کر دیا ہے۔ بہت لوگ زخمی اور شہید ہو رہے ہیں۔"

"کیا انہوں نے اسرائیل کے لوگوں کو مارا تھا؟" حرا نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا، وہ تو بے قصور ہیں۔"

افطاری کا وقت قریب تھا۔ سو مزید گفتگو مؤخر ہوگئی۔ حسب معمول افطاری سے پہلے ابو جی نے دعا کروائی اور دعا کا بیشتر حصہ فلسطینی مسلمانوں کے لیے تھا۔

رات وہ سونے کے لیے لیٹے تو ذہن میں وہی تصاویر گردش کرنے لگیں۔ نعمان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس نے عثمان کی طرف کروٹ لی تو وہ بھی تکیے میں سر دیئے رو رہا تھا۔

"عثمان!" نعمان نے اسے پیار سے پکارا۔

"بھیا! رومت، دُعا کرو۔" دونوں نے دل سے اپنے مظلوم

بھائی بہنوں کے لیے دعا کی۔

اگلے دن وہ دونوں اپنا چھٹیوں کا کام کر رہے تھے۔ حرا گڑیا کے ساتھ مصروف تھی، جب بڑے ماموں کی آمد ہوئی۔ سب اپنی مصروفیات چھوڑ کر ان کے استقبال کو لپکے۔

''السلام علیکم، ماموں جی!''

''وعلیکم السلام، پیارے بچو!'' انہوں نے حرا کو گود میں اُٹھا لیا اور نعمان، عثمان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ امی بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ کافی دیر بچوں سے گپ شپ کرتے رہے اور جاتے ہوئے انہیں دعوت دے گئے کہ اتوار کو افطاری ان کے گھر کریں جہاں چھوٹے ماموں اور خالہ کے اہل خانہ بھی افطاری پر مدعو ہیں۔ بچوں نے زور و شور سے ہامی بھری اور بے چینی سے اتوار کا انتظار کرنے لگے۔

ان کے جاتے ہی نعمان اپنے کمرے میں گیا، الماری کے سب سے اوپر والے خانے سے ایک لفافہ نکالا اور رقم گننے لگا۔ وہ ایک سال سے اپنا جیب خرچ، عیدی اور مختلف مواقع پر ملنے والے پیسے جمع کر رہا تھا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول کار خریدنی تھی۔ یہ اس کا اور اس کے تایا زاد یاسر کا جنون تھا اور دونوں نے اکٹھے ہی رقم جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ آج بھی ماموں جان نے اسے سو روپے دیئے تھے۔ اس نے وہ بھی سابقہ جمع شدہ رقم کے ساتھ رکھ دیئے اور یاسر کو فون کیا تاکہ اس سے پوچھ سکے کہ کتنی رقم جمع ہوئی ہے۔

یاسر کی بچت بھی لگ بھگ نعمان کی بچت کے برابر ہی تھی۔ باتوں باتوں میں نعمان نے اس کو فلسطین پر اسرائیلی حملے کی بابت بتایا۔ وہ بھی سن کر دکھی ہو گیا۔ آخر میں نعمان نے اسے اتوار کو ماموں کے گھر افطاری کی اطلاع دی۔ وہ ہنس دیا۔ ''تم تو بہت خوش ہو گے۔'' نعمان مسکرایا۔ ''ہاں یار، ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھار ہی موقع ملتا ہے کہ سب اکٹھے ہوں۔ خصوصاً حسن ماموں تو اپنے اسپتال میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ ان سے ملاقات کرنی ہو تو گھر کی بجائے اسپتال جانا ہی بہتر ہے۔''

''چلو، اچھا ہے۔ اب اتوار کو ان سے بھی مل لینا۔'' ''ان شاء اللہ۔ اچھا اللہ حافظ!''

......☆......

نعمان جب بھی نماز کے بعد دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا تو دھیان فلسطینی بچوں کی طرف چلا جاتا۔ ''کاش میں ان کے لیے کچھ کر سکتا۔'' وہ حسرت سے سوچتا مگر اس کے بس میں کچھ نہ تھا۔

اتوار کو حسب توقع بڑے ماموں کے گھر افطاری شان دار رہی۔ ان کو زیادہ لطف اپنے کزنز سے ملنے میں آیا۔ حسن ماموں تو افطاری سے دس منٹ پہلے ہی پہنچے۔ وجہ وہی اسپتال کی مصروفیت۔ ماموں ایک فرض شناس ڈاکٹر تھے۔

واپس آتے ہوئے بڑے ماموں نے دوبارہ دعوت دی۔ ''آپ لوگ عید کا دن بھی یہیں گزاریئے گا۔''

''بہت شکریہ محسن بھائی۔'' ابو نے جواب دیا۔ ''مگر ہمارا عید پر سیالکوٹ جانے کا ارادہ ہے۔ بلال بھائی بہت اصرار کر رہے ہیں اور ابا جان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے، ان کی عیادت بھی ضروری ہے۔'' ابو جی نے نعمان کے تایا جان کا ذکر کرتے ہوئے شائستگی سے معذرت کر لی۔

بچے تو یہ سنتے ہی خوشی سے اُچھل پڑے اور نعمان نے تو فوراً جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ ''دادا ابو تو اتنی ساری عیدی دیتے ہیں، پھر تایا جی، تائی جی اور سلمیٰ آپی سے بھی عیدی ملے گی۔ ابو کے کزن انکل منور بھی سیالکوٹ میں ہی رہتے ہیں، یقیناً ان کے گھر بھی جائیں گے، وہاں سے بھی عیدی ملے گی۔ لگتا ہے عید کے بعد میں ریموٹ کنٹرول کار

لے لوں گا۔'' اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ دروازہ پار کرتے ہوئے وہ ماموں کو یاد دہانی کروانا نہ بھولا۔ ''ماموں جی ہم، عید بے شک تایا جی کے ہاں کریں گے مگر واپس آ کر آپ سے بھی عیدی لیں گے۔'' صد شکر کہ امی، ابو نے اس کی بات نہیں سنی، ماموں مسکرائے۔ ''کیوں نہیں بیٹا، ضرور دوں گا۔'' اور وہ شاداں و فرحاں گھر واپس لوٹا۔

گھر آتے ہی نعمان نے یاسر کو فون کر کے عید وہاں منانے کا مژدہ سنایا وہ بھی بے چینی سے ان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

خلاف توقع حسن ماموں سے جلد ہی دوبارہ ملاقات ہو گئی۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ لاؤنج میں سبھی اہل خانہ موجود تھے، جب انہوں نے بات شروع کی۔ ''آپ لوگوں کو فلسطین کی موجودہ صورت حال سے تو آگاہی ہو گی۔ ستم یہ ہے کہ اب اسرائیل نے اسپتالوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ فلسطین میں ادویات، ایمبولینسوں اور ڈاکٹروں کی بہت ضرورت ہے۔ اسلامی ممالک کے ڈاکٹروں کی تنظیم FIMA نے فلسطین کی امداد کی اپیل کی ہے اور پاکستانی ڈاکٹروں نے کم از کم دو ایمبولینسوں کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے۔ جس کے لیے تقریباً 80 لاکھ درکار ہیں۔ اگر آپ تعاون کرنا چاہیں تو یقیناً اللہ آپ کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔''

اللہ کی راہ میں دینے کے لیے تو امی، ابو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ امی اپنے کمرے میں جا کر رقم لے آئیں۔ ابو نے چیک لکھ کر ماموں کے حوالے کیا اور نعمان...... اس کے ذہن میں کچھ دیر ہی کشمکش رہی۔

وہ فلسطینی بچوں کے لیے کچھ کرنے کی خواہش......

دعا سے بڑھ کر کچھ......

میری خواہش ریموٹ کنٹرول کار......

صدقہ، انفاق، اللہ کو قرض......

اور فیصلہ ہو گیا۔ وہ اٹھا اور اپنے کمرے کی الماری سے جمع شدہ پیسوں کا لفافہ لا کر ماموں کو پکڑا دیا۔ عثمان اور حرا نے وعدہ کیا کہ وہ عید کے بعد عیدی کی رقم فلسطین کے لیے دیں گے۔ ماموں ان کے جذبے سے بہت متاثر ہوئے۔

......☆......

نعمان بہت دیر سے یاسر کو سمجھا رہا تھا مگر وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔ وہ لوگ دوپہر کو ہی تایا جی کے گھر پہنچے تھے اور اب عصر کے بعد وہ یاسر کے کمرے میں موجود تھا جب اس نے یاسر کو وہ سب باتیں بتائیں جو حسن ماموں نے کی تھیں، مگر یاسر ایک روپیہ بھی دینے کو تیار نہیں تھا بلکہ وہ نعمان کو بھی سمجھا رہا تھا۔

''یہ سب تنظیمیں وغیرہ فراڈ ہوتی ہیں، خود ہی پیسے کھا جاتی ہیں۔''

''اب ایسے الزام تو نہ لگاؤ۔'' نعمان تڑپ اٹھا اور تاسف سے بولا۔

''تم نے تو خوامخواہ اپنی رقم گنوائی۔'' مگر نعمان کے دل میں ذرہ بھر پشیمانی نہیں تھی۔ ''میں نے اللہ کی راہ میں صدقہ دیا ہے۔ یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کو کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔''

''مگر میں نے وہ کار خریدنی ہے۔'' یاسر نے کہا۔

''کار بعد میں خریدی جا سکتی ہے۔'' نعمان نے جواب دیا۔

''میں پورے سال سے پیسے جمع کر رہا ہوں، اب جب تھوڑی سی کمی رہ گئی ہے تو میں ساری محنت ضائع کر دوں؟'' یاسر تنک کر بولا۔

''دیکھو یاسر، صدقہ بلاؤں، مصیبتوں کو دور کرتا ہے۔''

''مجھ پر فی الحال کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی اور نہ کوئی بلا آئی ہے۔'' وہ بدتمیزی سے بولا تو نعمان دکھ اور افسوس کے جذبات میں گھرا وہاں سے اٹھ آیا۔ ''اللہ تمہیں ہدایت دے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ باقی کے دن بھی نعمان اور یاسر ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہے۔ یاسر اس کو چڑانے کے لیے عثمان کو اپنی آنے والی ریموٹ کنٹرول کار کے قصے سناتا مگر نعمان کے دل میں بہت سکون تھا۔ اسے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہ تھا۔

عید کے تیسرے دن وہ لوگ واپس آ گئے۔ وہ یاسر والی بدمزگی کو بھول کر دوبارہ پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ عثمان کی زبانی ہی اسے خبر ہوئی کہ یاسر نے اپنی پسندیدہ کار خرید لی ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہے، اس کی رفتار بہت تیز ہے اور اس کی بتیاں بھی جلتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سب رشتہ داروں سے ملی ہوئی عیدی جوں کی توں رکھی تھی۔ نعمان کا ارادہ تھا کہ اگلے سال تک وہ دوبارہ مطلوبہ رقم جمع کر لے گا اور پھر وہ بھی کار خرید لے گا۔

کچھ دن بعد ہی بارشوں کی وجہ سے گرمی کی شدت میں کافی کمی آئی مگر یہ بارشیں سیلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ بہت سے شہر زیر آب آ گئے اور ان میں سے ایک سیالکوٹ بھی تھا جہاں نعمان کے تایا جی کا گھر تھا۔ وہ لوگ بمشکل جانیں بچا پائے، گھر کے سامان میں سے صرف زیور اور نقدی سنبھال سکے۔ باقی پورا گھر پانی کی لپیٹ میں تھا۔

پورا گھر...... یاسر کی سرخ رنگ کی ریموٹ کنٹرول کار بھی......!!! مصیبت نازل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

میں ایک سادہ دیہاتی لڑکا اپنے گاؤں میں پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ پچھلی جماعتیں میں نے امتیازی حیثیت سے پاس کی تھیں۔ مجھے اپنے گھر والوں کے ساتھ شہر میں آنا پڑا۔ جس علاقے میں ہم اقامت پذیر ہوئے، اس کے سب سے اچھے اسکول میں ابو نے مجھے داخل کروایا۔ اسکول نئے گھر سے دُور تھا مگر گاؤں کی پُرمشقت زندگی کے مقابلے میں یہ تکلیف بہت ادنیٰ تھی۔ میرا داخلہ بہت مشکل سے ہوا کیوں کہ میں انگریزی میں بہت کم زور تھا۔ سخت محنت اور ٹیوشن کی یقین دہانی پر مجھے پانچویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔

پہلے دن پرنسپل صاحبہ مجھے خود لے کر کمرۂ جماعت میں آئیں۔ انہوں نے بچوں کو بتایا کہ میں ان کا نیا ساتھی ہوں۔ پڑھائی کچھ دن ہوئے شروع ہو چکی ہے، لہٰذا سب میری مدد کریں۔

اس دن مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ میرے بال بہت بڑے تھے اور ان میں ضرورت سے زیادہ تیل لگا ہوا تھا۔ بالوں کی سیدھی مانگ اور گھبرائے ہوئے چہرے کی وجہ سے میں دُور سے ہی پہچانا جا رہا تھا کہ میں کسی دیہات سے آیا ہوں۔ شلوار کے پائنچے بہت کھلے تھے۔ اگرچہ میں نے نیا سوٹ پہنا ہوا تھا مگر اس کی سلائی گاؤں میں کرائی گئی تھی اور یہ شہر تھا۔ زیادہ تر بچے تو یہاں شلوار قمیص کم پہنتے تھے۔ میں نے بچوں کو دبی دبی ہنسی ہنستے دیکھا۔ اُستانی صاحبہ نے حاضری رجسٹر میں میرا نام لکھا۔ انہوں نے حاضری لینی شروع کی تو کاشف کے نام پر میں چونکا۔ وہ دبلا پتلا لڑکا مجھے پسند آیا۔ گاؤں میں میرا سب سے اچھا دوست کاشف گجر تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اسے اپنا دوست بناؤں گا۔

اُستانی نے میرا تعارف کروایا اور مانیٹر سے کہا کہ مجھے پچھلا کام سمجھائیں۔ مجھے حکم دیا کہ دو تین دن تک یونی فارم اور کتابیں لے لوں۔ ٹیچر کے کمرۂ جماعت سے باہر نکلتے ہی کچھ لڑکے میری ڈیسک کے گرد جمع ہو گئے۔ انہی کے عقب سے کسی نے زور سے کہا: "ارے یہ نیا اخروٹ کہاں سے آ گیا......؟"

اس بات پر سارے بچے ہنسنے لگے تھے۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں ہنسی تھیں۔ اس دن کے بعد سے یہ میرا نام بن گیا جیسے میری چڑ ہو۔ میری عدم موجودگی میں اور کبھی کبھار میرے سامنے بھی مجھے اخروٹ کہہ کر پکارا جانے لگا۔

میں اس بات کا بُرا نہیں مناتا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ اخروٹ میرا پسندیدہ میوہ تھا اور دوسرا یہ کہ میں خود ان باتوں پر ہنستا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ کس قدر بے فکرے لوگ ہیں۔ دوسروں کی فکر کرتے ہیں اور اپنے بارے میں اپنے وقت کے بارے میں نہیں سوچتے۔ مجھے یہ بے وقوف معلوم ہوتے تھے۔

میری بے نیازی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرا نام پکا نہ ہو سکا۔ اکثر

بچوں نے مجھے اخروٹ کہنا چھوڑ دیا۔ کچھ میرے ساتھیوں نے بہت کوشش کی کہ میں چڑ جاؤں، ناراضگی ظاہر کروں مگر ان کا منصوبہ میں نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ کاشف مجھے بہت کہتا تھا کہ میں اُستانی سے ان کی شکایت لگاؤں مگر میں منع کر دیتا۔ آخر اس نے خود ہی اُستانی سے کہہ دیا کہ بچے مجھے اخروٹ کہتے ہیں۔ حساس اور ہمدرد طبیعت کی مالک مس غزالہ نے فوراً اس بات کا نوٹس لیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کون کون اس نام سے پکارتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ پتا نہیں کون کہتا ہے اور کیوں کہتا ہے، بہرحال مجھے بُرا نہیں لگتا کیوں کہ کسی کے کہہ دینے سے کچھ ہو جاتا تو دُنیا اوپر نیچے ہو جاتی اور اگر کسی کو مجھے اخروٹ کہہ کر خوشی ہوتی ہے، تو میں بھی اس میں خوش ہوں، سو بار مجھے اخروٹ کہیں۔

مس غزالہ بہت متاثر ہوئیں۔ انہوں نے مجھے ایک ہیرو قرار دیا اور بچوں سے کہا کہ وہ بھی میری طرح کشادہ دل بنیں۔ مجھ سے صبر اور برداشت سیکھیں۔

میں آپ کو کاشف کے بارے میں بتانا بھول گیا۔ وہ میرا پکا دوست بن چکا تھا۔ میں اس سے انگریزی میں مدد لیتا تھا اور اسے حساب سکھاتا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ حساب میں بہت اچھے نمبر لیے اور میں نے خود کو اخروٹ کہنے والوں کو ایک سچا اور کھرا جواب دیا۔ جب پانچویں جماعت کا رزلٹ آیا تو سب یہ جان کر دنگ رہ گئے کہ پہلی پوزیشن میں نے حاصل کی تھی۔ انگریزی میں کچھ نمبر کم ہونے سے اسکول بھر میں ٹاپ کرنے سے رہ گیا تھا۔

اس وقت تک میں نے اپنے آپ کو بدل لیا تھا۔ اپنی وضع قطع اپنے ہم جماعتوں جیسی بنا لی تھی۔ میں نے دن رات محنت کی تھی اور اپنے گاؤں کی طرح یہاں پر بھی پہلے نمبر پر آیا تھا۔ رزلٹ ملنے کے بعد اسکول بھر میں خوب ہلا گلا ہوا۔ ہم سب اپنی جماعت میں آخری مرتبہ جمع ہوئے تھے۔ سب مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔

میری ہم جماعت ثنا، مس سیما کی بہن تھی۔ اس کا پوری جماعت پر رعب قائم تھا۔ لڑکیوں میں وہ واحد لڑکی تھی جو مجھے میرے سامنے اخروٹ کہتی تھی۔ کاشف نے کئی بار کہا کہ ثنا کی شکایت لگاؤ یا کم از کم کوئی جواب دے دو مگر میں یہ کہہ کر منع کر دیتا تھا کہ ابھی جواب دینے کا وقت نہیں آیا۔ پھر جب وہ مجھے مبارک باد دینے آئی تو میں نے کاشف کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ آؤ دیکھ لو کہ جواب یوں بھی دیا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کچھ بنا کر دکھائیں تو آپ کے مخالف بھی آپ کو آ کر مبارک باد ضرور دیتے ہیں۔

کاشف شاید باہر تھا۔ ثناء میرے پاس آ کر بولی: ”سہیل! مبارک ہو تم اوّل آئے۔ ہم سب بہت حیران ہیں۔“

”شکریہ ثناء! میرے ہم جماعتوں نے میرا خیال رکھا اور میرا حوصلہ بڑھایا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا......!“ ثناء حیرت سے بولی۔

”کیوں......؟ کیا تم نے میرا خیال نہیں رکھا؟“ میں نے بھی حیرت ظاہر کی۔

”پتا نہیں!“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”اچھا سنو، سیما باجی کہہ رہی تھیں کہ میں تم سے ریاضی میں مدد لیا کروں۔ تم میرے ساتھ دوستی کرو گے نا......؟“

”نہیں......!“ میں نے صاف انکار کر دیا۔ ثنا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”کیوں؟“

میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ”اس لیے کہ میں ایک اخروٹ ہوں اور مونگ پھلی سے دوستی نہیں کر سکتا۔“

ثناء چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ حیران رہ گئی تھی کہ میں نے اسے مونگ پھلی کہا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر ڈیسک پر بیٹھ کر رونے لگی۔ میں گھبرا گیا کہ اب کیا کروں، کیسے اس سے معافی مانگوں۔ میرے مذاق پر یہ لڑکی اتنی رنجیدہ ہو جائے گی، میں نے سوچا نہ تھا۔ مدیحہ اس کے قریب بیٹھ کر اسے چپ کرانے لگی اور مجھے گھورتے ہوئے اس سے پوچھا کہ میں نے کیا کہا ہے۔

مدیحہ کے استفسار پر ثناء نے غصے سے بھرے لہجے میں بتایا کہ میں کتنا مغرور انسان ہوں اور مجھے لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں اور واقعی میں ایک اخروٹ ہوں، بلکہ مجھے اخروٹ کہنا نیکی کا کام ہے۔

مجھے ثناء کے انداز اور اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ ہم تین بھائی تھے اور ہماری بہن کوئی نہ تھی۔ میں تو خاص طور پر بہن کی محبت کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ ہر لڑکی میں مجھے اپنی بہن کا عکس نظر آتا تھا۔ ثناء بھی تو میری بہن تھی۔ وہ کبھی نہیں روئی مگر آج میں نے اسے رُلا دیا تھا۔ اس بات کا مجھے بھی دکھ ہوا۔ میرے ہنسنے پر ثناء اور چڑ گئی۔ میں نے فوراً کانوں کو پکڑ کر سوری کہا۔ وہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ پھر جب میں نے اٹھک بیٹھک شروع کی اور تیس تک پہنچا تو وہ ہنس دی۔ کوئی ناراض ہنس دے تو اس کا مطلب معاف کر دینا

ہوتا ہے۔

سب سمجھتے تھے کہ میں زیادہ سوشل نہیں ہوں۔ زیادہ میل جول رکھنے سے کتراتا ہوں مگر اس دن سب نے میرا یہ روپ بھی دیکھ لیا کہ میں کچھ کرنے پر آؤں تو کر گزرتا ہوں۔

کاشف نے مجھے گلے لگایا۔ وہ بھی مان گیا کہ اپنا آپ منوانے کے کئی طریقے ہیں اور تعلیم میں بہت طاقت ہے۔ بدلہ لینے اور اپنا سر بلند کرنے کے لیے تعلیم اچھا راستہ ہے۔

وہ بہت اچھا اور یادگار دن تھا۔ اساتذہ نے میرے ہم جماعتوں سے کہا کہ ان سب کو مل کر مجھے پارٹی دینی چاہیے، کیوں کہ میں نے کمال کر دیا ہے۔ سب مان گئے۔ پارٹی کے لیے دن مقرر ہو گیا۔ سب نے پیسے اکٹھے کر لیے۔ اس دن سب اپنے گھروں سے اپنا کھانا ساتھ لائے۔ اسکول میں کولڈ ڈرنک، جوس، سکو اور سموسے وغیرہ بھی تھے۔ کلاس روم کو جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ سچی بات ہے مجھے میرے دوستوں اور میری بہنوں نے بہت عزت دی تھی۔ ثناء تو میری بہت اچھی بہن بن گئی تھی۔ پارٹی ختم ہوئی تو میرے دوستوں نے مجھ سے مٹھائی کھلانے کی فرمائش کی۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے اتنی کام یابی حاصل کی ہے تو میرے گھر والے خوشی سے مجھے مٹھائی کے لیے رقم دے دیں گے مگر میں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ اوّل تو میرے والد ایک غریب کسان ہیں اور دوسرے یہ کہ میں گاؤں میں بھی ہمیشہ فرسٹ آتا رہا مگر انہوں نے مجھے مٹھائی کے لیے کبھی پیسے نہیں دیے۔

اس کے باوجود اگلے دن جب میں اسکول پہنچا تو میرے ہاتھوں میں مٹھائی کا ایک بڑا ڈبا تھا۔ مجھے پورا سال ستایا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنے دوستوں کو تھوڑا میں بھی تنگ کروں۔ کچھ کام یابی کا نشہ تھا یا شرارت کا موڈ۔

جب کاشف نے سب کے سامنے مٹھائی کا ڈبا کھولا تو اندر سے اخروٹ نکلے۔ ڈبا اخروٹوں سے لبریز تھا۔

اس دن اس نے اپنی پوری جماعت کو ہنستے دیکھا۔ میں بھی بہت ہنسا بلکہ میں اور کاشف تو اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کئی لڑکیاں ہنستے ہنستے کلاس سے بھاگ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ بات پورے اسکول میں پھیل گئی۔ سب لوگ ہنس رہے تھے۔ میں نے اپنے اساتذہ، چوکیدار، ماسی اور پرنسپل صاحب کو بھی ہنستے دیکھا اور اخروٹ..... وہ تو اعلیٰ قسم کے کشمیر کاغذی اخروٹ تھے جو ہاتھ میں دباتے سے ٹوٹ جاتے تھے اور کھانے میں بہت مزے دار تھے۔

اسی لیے سب مزے سے کھا رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔

اس دن سب نے تسلیم کر لیا کہ واقعی اخروٹ اخروٹ ہوتا ہے۔ کھانے میں مزے دار اور دماغ کے لیے مفید ہوتا ہے مگر کسی کے کہہ دینے سے کوئی اخروٹ نہیں بنتا۔ ☆☆☆

آبدوز

آبدوز اس کشتی کو کہتے ہیں جسے جب چاہیں پانی کی سطح پر چلائیں اور جب چاہیں پانی کے اندر دوڑائیں۔ اس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ دشمن کے بحری جہاز پر حملہ کرنے کے لیے کھلے جہاز یا عام کشتی پر جانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ پانی کے اندر چھپ کر جائیں تو دشمن کو پتا بھی نہیں چلتا تو یہ مقصد آبدوز نے پورا کیا۔

سب سے پہلی آبدوز 1620ء میں ہالینڈ میں بنائی گئی۔ یہ پانی کی سطح سے صرف پانچ گز نیچے اتر سکتی تھی۔ اسے بارہ ملاح ہاتھ سے چلاتے تھے۔ 1800ء میں بھاپ سے چلنے والی آبدوز بنائی گئی۔ 1898ء میں ہالینڈ میں پٹرول سے چلنے والی بیس (20) گز لمبی آبدوز بنائی گئی۔ اس نے برطانیہ، فرانس اور امریکا کے بحری افسروں کے سامنے جنگی تجربات کا مظاہرہ کیا۔ جنگی جہازوں کے مقابلے میں آبدوز کام یاب رہی۔

پہلی ایٹمی آبدوز امریکا نے 1955ء میں بنائی اور 1960ء میں ایک امریکی آبدوز نے پانی کی سطح پر ابھرے بغیر 84 دنوں میں دنیا کے گرد پورا چکر لگایا۔ آج کل امریکہ اور روس کی آبدوزیں سمندر میں ایک ہزار فٹ کی گہرائی تک اتر سکتی ہیں اور مہینوں پانی کے اندر رہ سکتی ہیں۔ جب آبدوز پانی میں پانچ سو فٹ کی گہرائی پر ہوتی ہے تو اس کے ہر مربع انچ پر تین ٹن دباؤ پڑا ہوتا ہے۔ آبدوز بنائی گئی جنگی مقاصد کے لیے تھی لیکن اب اس سے مفید کام بھی لیے جا رہے ہیں۔ تباہ شدہ جہازوں کے مسافروں کو بچایا جاتا ہے اور اب تحقیق کے کام کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح زمین پر خوراک کے لیے بے شمار ذرائع پیدا کیے ہیں، اسی طرح سمندر کے اندر بھی بے شمار چیزیں موجود ہیں جو کھانے پینے کے کام آ سکتی ہیں۔ آبدوز ایسی چیزیں تلاش کرنے میں بہت مفید ثابت ہو رہی ہے۔

(سنبل ناز فرید احمد، حیدر آباد)

میری زندگی کے مقاصد

عائشہ علی، لاہور
میں سی ایس پی افسر بن کر اپنے پاپا کا نام روشن کروں گی۔

طلال حسین، راولپنڈی
میں آرمی جوائن کر کے ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد حسن، میانوالی
میں پائلٹ بن کر ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

حیدر علی، بھلوال
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

احمد مجیب، پشاور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔

علی حسن، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر مستحق لوگوں کی مدد کروں گا۔

اقرا جاوید، لاہور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور انسانیت کی خدمت کروں گی۔
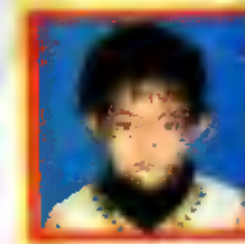
طیبہ بتول، لاہور
میں حافظ قرآن بن کر دین کی روشنی پھیلاؤں گی۔

ہشام حمید، اٹک
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور قوم کی خدمت کروں گا۔

حوریہ جاوید، لاہور
میں ایک اچھا انسان بنوں گی اور فلاحی کام کروں گی۔

دعا خان، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک کی خدمت کروں گی اور نیک مسلمان بنوں گی۔

عائشہ رضا، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

مریم، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

شاہ زیب خرم، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

شیخ محمد شارق، نوشہرہ
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کا خواب پورا کروں گا۔
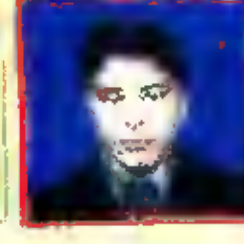
سعود الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان
میں آرمی جوائن کر کے ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد ابراہیم لطیف، ملتان
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

الماس فاطمہ، میانوالی
میں ٹیچر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گی۔

محمد سلمان، گلشن آباد
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور انسانیت کی خدمت کروں گا۔

بوجھو تو جانیں

1- ہے رفتار اس کی گفتار
کہہ دے باتیں کئی ہزار

☆

2- روشن روشن اس کی دُم
رات کو حاضر دن میں گُم

مدن سجاد، جھنگ صدر

3- اوپر رہ کر شور مچائے
نیچے آ کر آگ لگائے

☆

4- جس شے کو ہر دیس میں پایا
اس کی صورت ہے نہ سایہ

☆

5- خشکی پہ نہ ان کو پاؤ
پانی میں اترو تو کھاؤ

6- گڑ گڑ آؤں چھم چھم برسوں
خود باقی رہنے کو ترسوں

☆

7- دیواروں سے ٹیک لگائے
روز ہی سب کو پاس بلائے

عائشہ مجید، لاہور

8- ایک میدان میں پانچ سڑکیں

☆

9- آؤ بھیا بازار جائیں
ایک ڈبی میں دو رنگ لائیں

☆

10- ایک آئی گوروں کی فوج
خاک میں دیکھو ان کی موج
صورت ان کی ہو جیسے انڈہ
ہاتھ لگاؤ تو وہ ٹھنڈا

نجمہ شہناز، لاہور

جوابات: 1۔قلم 2۔جگنو 3۔آسمانی بجلی 4۔ہوا 5۔غوطہ
6۔بادل 7۔کیلنڈر 8۔ہاتھ 9۔انڈہ 10۔اولے/برف

ہندسے ملا کے معلوم کریں کہ یہ موٹی سی آنکھ کس کی ہے؟

اس ٹوکری میں چار کھلونے ہیں۔
کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کون سا کھلونا کس بچے کا ہے؟

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ کس پیغمبر کو ایک مچھلی نے نگل لیا تھا؟

i۔ حضرت یوسفؑ ii۔ حضرت یونسؑ iii۔ حضرت داؤدؑ

2۔ شیرِ بنگال جدوجہد آزادی کے کس لیڈر کو کہا جاتا ہے؟

i۔ مولانا محمد علی جوہر ii۔ مولوی فضل الحق iii۔ مولانا ظفر علی خان

3۔ تیز رفتار الیکٹران کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ الفاریز ii۔ بیٹاریز iii۔ گاماریز

4۔ مرزا غالب کے اس شعر کا دوسرا مصرع بتایئے۔

کھلتا کس پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ....

5۔ پاکستان میں کرکٹ کی سب سے بڑی ٹرافی کا کیا نام ہے؟

i۔ پاکستان ٹرافی ii۔ قائداعظم ٹرافی iii۔ حبیب بنک ٹرافی

6۔ ویت نام کس براعظم میں واقع ہے؟

i۔ براعظم امریکہ ii۔ براعظم ایشیاء iii۔ براعظم آسٹریلیا

7۔ قرآن پاک کے سب سے پہلے حافظ کون تھے؟

i۔ حضرت علیؓ ii۔ حضرت عثمانؓ iii۔ حضرت ابوبکرؓ

8۔ پاکستان کا وہ کون سا واحد جزیرہ ہے جہاں آبادی ہے؟

i۔ منوڑہ ii۔ گوادر iii۔ بن قاسم

9۔ پاکستان کا قومی جانور کون سا ہے؟

i۔ بارہ سنگھا ii۔ مارخور iii۔ ہرن

10۔ نظم "ساقی نامہ" علامہ اقبالؒ کے مجموعہ کلام بالِ جبریل میں ہے۔ یہ نظم کب لکھی گئی؟

i۔ 1935ء ii۔ 1936ء iii۔ 1937ء

جوابات علمی آزمائش جنوری 2015ء

1۔ عطیہ خداوندی 2۔ 14 کنگرے 3۔ کوئی رنگ نہیں 4۔ جاپان 5۔ آسٹریلیا 6۔ حرارت گیر کیمیائی عمل 7۔ 3000 فٹ بلند 8۔ کرنج، رزاتگی 9۔ کشمور (سکھر) 10۔ سبز پتوں والی سبزیاں

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ آمنہ عمران، لاہور (150 روپے کی کتب)

☆ حسن رضا سردار، کاموکے (100 روپے کی کتب)

☆ مریم اعجاز، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی:

رضوان اشہد، پشاور۔ منایل حلیم، اسلام آباد۔ لاریب ممتاز، لاہور۔ مومنہ ندیم، گوجرانوالہ۔ محمد عتیق الرحمٰن اسلم، میرپور آزاد کشمیر۔ نادیہ طارق، حیدر آباد۔ طٰہٰ یاسین، حیدر آباد۔ محمد زیان، محمد وردان، حافظ محمد زکوان، بہاول پور۔ محمد طیب اکرم، گوجرانوالہ۔ سعد زواد ضیغم، پشاور۔ رمیشہ نور، محمد ریحان احمد، اسلام آباد۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ عروہ جاوید وڑائچ، بہاول نگر۔ فائزہ رضا، گجرات۔ اریب ظفر، لاہور۔ لیاقت علی، عبدالخبیر، کراچی۔ محمد سمیع، کراچی۔ اسماور بنت آصف، پشاور۔ زینب محبوب، جہلم۔ راضیہ نعیم، نازیہ ندیم، راول پنڈی کینٹ۔ عروج نوید، لاہور۔ محمد اسامہ ملک، راول پنڈی۔ اسامہ ظفر راجہ، جہلم۔ محمد اسماعیل، عائشہ اسلام، اسلام آباد۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ روشن زمان، کرک۔ حامد رضا، بہاول پور۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ حسن عبداللہ، وشمہ، لاہور۔ محمد عثمان، کاموکے۔ حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ ضیغان احمد، لاہور۔ محمد جاشر، لاہور۔ علی عبداللہ، فیصل آباد۔ مشعال آصف، لاہور۔ محمد اواب، فیصل آباد۔ شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ ایمان جواد، اسلام آباد۔ مریم عبدالسلام شیخ، نواب شاہ۔ فاطمہ زاہد، ٹیکسلا۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ کومل صادق چوہدری، گوجرانوالہ کینٹ۔ کنول شہزادی قادری، خدیجہ نشان، حلیمہ نشان، حامد علی قادری، نفیسہ فاطمہ قادری، محمد عمر عطا قادری، محمد نوید قادری، نور حسین قادری، کاموکے۔ محمد عاطش رضا، لاہور۔ محمد ثوبان، بہاول پور۔ طاہرہ رانی، بہاول پور۔ سعد ناصر خان، لاہور۔ ناصرہ مقدس، شیخوپورہ۔ محمد حمزہ فاروق، اوکاڑہ۔ محمد حمزہ، فیصل آباد۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ طوبیٰ راشد، لاہور۔ صہیب نور، محمد اسامہ، عثمان نعیم، کراچی۔ ازکیٰ آصف، پشاور۔ عبداللہ مسعود، فیصل آباد۔ حفصہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ فراز، کراچی۔ پلوشہ مریم، پشاور۔

محاورہ کہانی

نیم حکیم خطرۂ جان

زبیدہ سلطانہ

شمسو چھوٹا سا تھا جب اس نے حکیم جی کے مطب میں دوائیاں کوٹنے پیسنے کا کام شروع کیا۔ اس کی ماں نے اسی امید پر اسے حکیم جی کے ہاں نوکری دلائی تھی کہ رفتہ رفتہ تجربہ حاصل کر کے وہ بھی بڑا ہو کر حکیم بن جائے گا۔

جب شمسو ذرا سمجھ دار ہو گیا تو حکیم جی اسے دوائیوں کا بکس اٹھوا کر ساتھ لے جانے لگے یا جہاں بھی کسی مریض کو دیکھنے جاتے، شمسو کو ساتھ لے جاتے۔ رفتہ رفتہ شمسو کو دوائیوں کی پہچان ہو گئی۔ وہ حکیم جی کی ہر بات کو غور سے سنتا اور دیکھتا تھا۔ ایک خاص بات جو شمسو نے نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ حکیم جی مریض کی نبض دیکھتے ہی پوچھتے: ”فلاں چیز کھائی ہو گی، چنے کی دال کھائی تھی نا؟“ کبھی کہتے: ”بادی کا اثر ہے، گوبھی کھائی ہو گی؟“ ایک دن شمسو نے حکیم جی کو اچھے موڈ میں دیکھ کر پوچھا:

”حکیم جی! یہ آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ مریض نے کیا کھایا ہو گا؟“

”ارے بے وقوف! یہ کون سا مشکل کام ہے۔ مریض کے گھر میں یا آس پاس کوئی نہ کوئی ایسی چیز پڑی نظر آ جاتی ہے مثلاً کوئی چھلکا، کوئی بچی کچی چیز، اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ مریض نے کیا کھایا ہو گا۔“

شمسو نے یہ خاص نکتہ بھی ذہن نشین کر لیا۔ کئی سالوں بعد جب حکیم جی فوت ہو گئے تو ان کا شاگرد شمسو، حکیم شمس الدین بن کر گاؤں میں حکمت چلانے لگا۔ لوگوں نے اسے ہمیشہ حکیم جی کے ساتھ دیکھا تھا، اس لیے اس سے علاج کرانے لگے۔ وہ اندازے سے کوئی دوائی دے دیتا اور اتفاق کی بات کہ اکثر مریض اچھے بھی ہو جاتے۔ تشخیص کا طریقہ اسے یاد تھا کہ مریض کے گھر میں داخل ہوتے ہی جائزہ لیتا اور جو گری پڑی چیز نظر آتی، اس پر اپنی رائے قائم کر لیتا۔

ایک دن وہ ایک مریض کو دیکھنے گیا، جہاں اسے کہیں کوئی کوڑا کرکٹ یا چھلکا وغیرہ نظر نہ آیا۔ جگہ صاف ستھری تھی۔ سردی کا موسم تھا۔ مریض اپنے گرم بستر میں پڑا تھا۔ حکیم نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کمرے میں بھی کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دی جسے وہ تشخیص کی بنیاد بناتا۔ اچانک اس کی نگاہ مریض کی ڈاڑھی پر پڑی۔ ڈاڑھی کے سیاہ بالوں میں نمدے کا سفید دھاگا عین ٹھوڑی کے نیچے الجھا ہوا تھا۔ (نمدہ، کچی اون سے بنا ہوا غالیچہ یا توشک ہوتا ہے جو سردیوں میں بستر پر بچھاتے ہیں۔) نمدے کے دھاگے کو دیکھ کر حکیم شمس الدین ایک دم چونک کر بولا: ”ہاں اب سمجھ میں آیا! آپ نے نمدہ کھایا ہو گا!“

مریض نے گھبرا کر اپنی کلائی حکیم سے چھڑا لی اور کہا: ”آپ تشریف لے جایئے! مجھے آپ سے علاج نہیں کرانا، آپ تو نیم حکیم خطرۂ جان ہیں۔“

بچو! جو معالج اپنے کام میں مہارت نہ رکھتا ہو، اس سے علاج کرانا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ہے، لہٰذا ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے۔

مصری جھنڈا

جدید مصر کے بانی محمد علی پاشا نے مصری جھنڈا متعارف کروایا۔ اسلامی ملک مصر کے موجودہ جھنڈے کو 28 فروری

1992ء میں لہرایا گیا۔ یہ تین رنگی جھنڈا ہے جس میں سرخ، سفید اور سیاہ برابر متوازی دھاریاں ہیں۔ درمیان میں سفید دھاری کے وسط میں مشہور مسلم شخصیت سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا عقاب سنہرے رنگ میں بنا ہے۔ سرخ رنگ برطانوی راج سے نجات، سفید رنگ امن اور سیاہ رنگ بیرونی قوتوں سے چھٹکارے کی علامت ہے۔ 1922ء سے قبل مصری جھنڈا سبز رنگ کا تھا جس پر ایک ہلال اور تین ستارے بنے تھے۔ یہ تین ستارے ملک میں رہنے والے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو ظاہر کرتے تھے۔ مصر میں 23 جولائی کو یوم انقلاب منایا جاتا ہے۔ اس ملک کی تاریخ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت سے تین ہزار برس سے بھی پرانی ہے۔ مصر (Egypt) کا رقبہ $1002450Km^2$ ہے۔ اس کا دارالحکومت قاہرہ (Cairo) ہے۔

سرد موسم میں انفیکشن کے اثرات کو کم کرنے کے لیے لوگ جوشاندہ پیتے ہیں۔ بنفشہ اس کا اہم جز ہے۔ بنفشہ یا Violet Plant کا سائنسی نام "Viola" ہے جس کی چھ سو Species ہیں۔ اس کا تعلق "Violleae" خاندان سے ہے۔ اس کو فروری کا پھول (Flower of February) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جھاڑی نما سدا بہار پودا ہے۔ اس کے پتے دل نما ہوتے ہیں۔ پھول وائلٹ رنگ کی پانچ پتیوں (Petals) پر مشتمل ہوتا ہے۔ مارچ اور اپریل
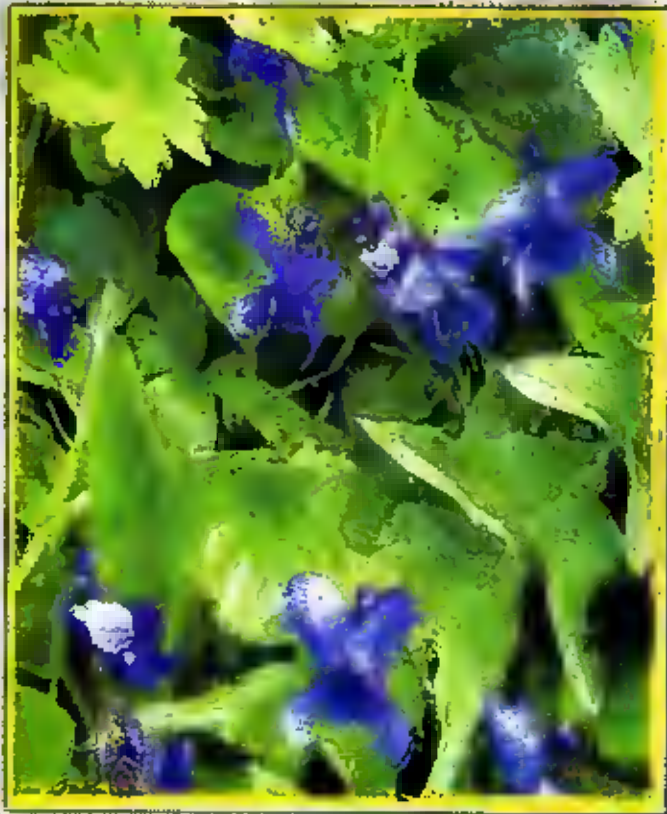
میں اس پودے پر بہار آتی ہے۔ پھول کا رنگ پیلا، سفید، نیلا اور کریمی بھی ہوتا ہے۔ اس کے خوب صورت پھول، مختلف کھانوں کو سجانے کے کام بھی آتے ہیں۔ بنفشہ کے پودے میں کیمیائی مادے پائے جاتے ہیں جنہیں "Cyclotides" کہا جاتا ہے۔ ان کیمیکلز کی وجہ سے جراثیم کی افزائش رُک جاتی ہے اور یہ پیٹ کے حشرات

کے خلاف بھی موثر ہیں۔ پھولوں میں موجود خوشبو کی وجہ سے اس کو پرفیوم انڈسٹری میں بھی اہمیت حاصل ہے۔ فلاور آف فروری کو یقین، عقل مندی اور اُمید کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

لولانگ

انسانی تاریخ میں اب تک مشاہدہ میں آنے والے سب سے بڑے مگرمچھ کو لولانگ "Lolong" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گزشتہ برس یعنی 10 فروری 2013ء کو یہ عظیم الجثہ مگرمچھ مر گیا۔ یہ نمکین پانی (Salt water) انڈو پیسفک (Indo Pacific) علاقے میں رہتا تھا۔ یہ 20 فٹ 3 انچ (6.17 میٹر) لمبا اور 2370 پاؤنڈ (1075 کلوگرام) وزنی تھا۔ آسٹریلیا کے ماہر ڈاکٹر آدم بیرٹن (Adam Britton) نے اسے ناپا اور بعدازاں اسے ایک تالاب میں رکھا گیا تھا۔ یہ مگرمچھ فلپائن سے 13 ستمبر 2011ء کو پکڑا گیا تھا۔ لگ بھگ 100 آدمی اسے بمشکل زمین پر

لائے تھے۔ فلپائنی مگرمچھ کے شکاری پر اس کا نام لولانگ رکھا گیا۔ رات 8 بجے بوجہ نمونیا اور فنگل (Fungal) انفیکشن سے اس کا انتقال ہوا۔ تالاب کے پانی سے نکال کر اسے فریز کر دیا گیا تاکہ اسے کسی سائنسی میوزیم میں رکھا جا سکے۔

تالاب

دُنیا کا سب سے بڑا تالاب (Wetland) جو برازیل، بولیویا اور پیراگوئے یعنی تین ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ لگ بھگ 140000 سے 195000 مربع کلو میٹر یعنی 54000 سے 75000 مربع میل پر مشتمل ہے۔ اس تالاب کا نام "Pantanal" ہے۔ یہ پرتگالی زبان کے لفظ "Pantano" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے "تالاب"۔ ہزاروں انواع کے پودے

اور جانور یہاں قیام پذیر ہیں۔ تالاب میں زیادہ تر پانی پیراگوئے کے دریا سے آتا ہے۔ پانی کا درجۂ حرارت صفر سے 40C° (32-104F°) تک رہتا ہے۔ دُنیا میں ہر سال 2 فروری کو تالابوں کا دن منایا جاتا ہے۔ ایرانی شہر "Ramsar" میں 2 فروری 1971ء کو اقوام متحدہ کنونشن نے اس عالمی دن کی منظوری دی تھی۔

☆☆☆

ضربِ کلیم

یعنی

اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبالؒ

دادی: ''تمہاری ٹیچر آ رہی ہیں، تم چھپ جاؤ۔''

پوتا: ''پہلے آپ چھپ جائیں کیوں کہ میں آپ کی وفات کی وجہ سے تین دن کی چھٹی پر ہوں۔'' (شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور)

ایک بچہ گلی میں کھیل رہا تھا۔ کہیں سے ایک کتا آیا اور اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ بچہ روتا ہوا گھر بھاگا۔ ماں نے پوچھا: ''کیوں رو رہے ہو؟ کیا کتے نے کاٹ لیا ہے؟''

بچے نے روتے ہوئے کہا: ''ابھی تو چکھ ہی رہا تھا، اگر میں بھاگ نہ آتا تو کاٹ لیتا۔'' (محمد حسن ندیم، اٹک)

سیاست دان (ڈاکٹر سے): ''ڈاکٹر صاحب جب میں تقریر کرنے لگتا ہوں تو میرا جسم کانپنے لگ جاتا ہے اور زبان تالو سے چمٹ جاتی ہے۔''

ڈاکٹر: ''کوئی بات نہیں، جھوٹ بولتے وقت ایسے ہوتا ہے۔''

(مریم نایاب، نوشہرہ)

ایک بار مذاکرات میں گاندھی نے قائداعظم سے کہا: ''جب میں سر کے بل کھڑا ہوتا ہوں تو خون میرے سر میں جمع ہو جاتا ہے مگر میں سیدھا کھڑا ہوتا ہوں تو خون اپنی جگہ پر ہی رہتا ہے۔''

قائداعظم نے کہا: ''خون اسی جگہ پر اکٹھا ہوتا ہے جہاں جگہ خالی ہو۔'' (احمد یار، لاہور)

باپ (بیٹے سے): ''بیٹا الف سے کیا آتا ہے؟''

بیٹا: ''ابو! الف سے کچھ نہیں آتا، سب کچھ پیسوں سے آتا ہے۔''

☆

حامد (شہزاد سے): ''تمہارے سر پر یہ پٹی کیوں بندھی ہے؟''

شہزاد (ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے): ''تمہیں یہ سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں؟''

حامد: ''ہاں! آ رہی ہیں۔''

شہزاد: ''بس وہ مجھے نظر نہیں آئی تھیں۔'' (نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ)

آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ ایک بے وقوف نے دوسرے سے پوچھا: ''یہ اوپر کیا چمک رہا ہے؟'' دوسرا بولا: ''میں تو خود پردیسی ہوں، کسی اور سے پوچھ لو۔'' (محمد حسیب جابر، پیر محل)

ایک کنجوس آدمی صبح ہی صبح چھت پر چڑھ کر ٹی وی کا انٹینا درست کر رہا تھا۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ تیسری منزل سے نیچے کی طرف گرا۔ جب وہ باورچی خانے کے قریب سے گزرا تو چیخ کر بولا: ''بیگم! ناشتے میں ایک انڈا کم کر دینا، میں آج ناشتا نہیں کروں گا۔'' (مقدس چوہدری، راول پنڈی)

استاد (شاگرد سے): ''تم روزانہ دیر سے اسکول آتے ہو، الارم والی گھڑی رکھ کر سویا کرو۔''

شاگرد: ''جی! رکھ کر تو سوتا ہوں لیکن وہ اس وقت بجتی ہے، جب میں سو رہا ہوتا ہوں۔'' (محمد سعید رضا، بورے والا)

ایک شخص نے سرد آہ بھر کر کہا: ''اس زندگی سے تو موت ہی اچھی ہے۔'' اسی وقت ایک ڈاکو پستول تانتے ''کیا میں تمہاری جان لینے کا کام میں کروں گا۔'' اس پر وہ شخص فوراً بولا: ''تو کیا! آدمی مذاق بھی نہیں کر سکتا۔'' (حذیفہ، ایبٹ آباد)

استاد (شاگرد سے): ''وہ کون سی چیز ہے جو سب سے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے؟''

شاگرد: ''مچھلی۔''

استاد: ''وہ کیسے؟''

شاگرد: ''میرے ابا جان نے ایک مچھلی شکار کی تھی، اب جب بھی اس کا ذکر ہوتا ہے ابا جی اسے دو انچ بڑھا دیتے ہیں۔'' (طوبیٰ وحید، ہری پور)

غریب علاقے کی بیوی شوہر کے ساتھ ایک ریستوران میں گئی۔

شوہر (بیوی سے): ''کیا لو گی؟''

بیوی: ''جو آپ کہیں۔''

شوہر: ''اچھا ویٹر مینیو (Menu) لانا۔''

بیوی: (شرماتے ہوئے) ''میں بھی مینیو ہی کھاؤں گی۔''

(نمرہ ظہور، شیخوپورہ)

☆☆☆

رینبو رائس

اجزاء:

اُبلے چاول:	دو کپ	اُبلے چاول (پیلے):	ایک کپ	اُبلے چاول (لال):	ایک کپ
گاڑھی ہری چٹنی:	ایک کپ	بھنا ہوا قیمہ:	دو کپ		

بھنا قیمہ بنانے کے اجزاء:

تیل:	ایک کھانے کا چمچ	مٹن کا قیمہ:	آدھا کلو	کٹی پیاز:	ایک عدد
کٹا ٹماٹر:	ایک عدد	ادرک لہسن پیسٹ:	ایک چائے کا چمچ	پسی لال مرچ:	ایک چائے کا چمچ
پسی ہلدی:	ایک چائے کا چمچ	کٹی ہری مرچ:	تین عدد	کٹا ہرا دھنیا:	دو کھانے کے چمچ
نمک:	ایک چائے کا چمچ	چینی:	ایک چائے کا چمچ	سرکہ:	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: برتن میں ایک کھانے کا چمچ تیل گرم کریں، پھر آدھا کلو مٹن کا قیمہ، ایک عدد کٹی پیاز، ایک عدد کٹا ٹماٹر، ایک چائے کا چمچ ادرک لہسن کا پیسٹ، ایک چائے کا چمچ پسی لال مرچ، ایک چائے کا چمچ پسی ہلدی، تین عدد کٹی ہری مرچ، دو کھانے کے چمچ کٹا ہرا دھنیا اور ایک چائے کا چمچ نمک ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ پھر ایک چائے کا چمچ چینی اور ایک کھانے کا چمچ سرکہ ڈال کر مزید بھونیں کہ قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے۔

رینبو رائس کی ترکیب: ایک رائس مولڈ یا کیک پین میں پہلے اُبلے سفید چاولوں کی ایک تہہ لگائیں۔ اس پر بھنا ہوا قیمہ پھیلا دیں۔ اب اُبلے ہوئے پیلے چاولوں کی تہہ لگائیں۔ اب ہری چٹنی پھیلا دیں۔ پھر لال اُبلے چاول اور سفید چاولوں کی ایک ایک تہہ لگا دیں۔ اوپر سے اچھی طرح دبائیں کہ لیئرز جم جائیں۔ پھر فوائل سے لپیٹ کر رکھ دیں اور سرونگ کرتے ہوئے پلیٹ میں پلٹ لیں۔ رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

چٹخارہ مرغ مسلم

اجزاء:

مرغی (ثابت):	ایک عدد	بھنی اجوائن:	[illegible]	[illegible]	ایک چائے کا چمچ
ادرک کا پاؤڈر:	ایک چائے کا چمچ	لہسن کا پاؤڈر:	ایک چائے کا چمچ	نمک:	ایک چائے کا چمچ
جائفل اور جاوتری:	آدھا آدھا چائے کا چمچ	پسی ہوئی لال مرچ:	دو چائے کے چمچ	لیموں کا رس:	آدھا کپ

ترکیب: یہ تمام چیزیں ایک برتن میں ڈال کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب آدھا کپ تیل گرم کریں اور اس میں 10 عدد ہری مرچ ڈالیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو اس میں مرغی ڈال کر ہلکی آنچ پر 10 منٹ پکائیں۔ جب مرغی گل جائے تو ایک پاؤ دہی اور ایک کپ پیاز ڈال دیں اور مزید آدھے گھنٹے تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ مزے دار مرغ مسلم تیار ہے۔

میں بغداد میں خوش حالی کے دن گزار رہا تھا۔ دن بھر دوستوں کا ساتھ ہوتا اور گپ شپ کے ساتھ کھانا پینا چلتا رہتا۔ بے فکری اور آرام کا یہ حال تھا کہ میرے لیے ہر دن عید کا دن اور ہر رات شب برات تھی۔ بڑے مزے کی زندگی گزر رہی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں اِس ایک جیسی زندگی سے اکتا گیا اور جی میں آیا کہ اب اگلے سفر کی تیاری کرنی چاہیے۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے، انسان کو کسی ایک حالت پہ قرار نہیں آتا۔ جنگ ہو تو امن کی خواہش کرتا ہے اور اگر امن نصیب ہو جائے تو جنگ کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔

جب میں نے یہ سوچا کہ اب تیسرے سفر پہ جاؤں گا تو فوراً ہی یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ یہ آرام و آسائش کی زندگی نہیں چھوڑنی چاہیے۔ بیرونی ممالک کا سفر کرنے میں سوائے اذیتوں اور تکلیفوں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا، خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پھنس گیا تو کیا کروں گا؟ چناں چہ میں نے کئی مرتبہ اس خیال کو ذہن سے جھٹکا لیکن آخر کب تک، آخرکار ایک دن بحری سفر کی خواہش غالب آ ہی گئی اور میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوستوں سے آخری ملاقاتیں کیں، وصیت نامہ لکھا۔ بیوی بچوں کو خدا کے سپرد کیا اور تجارتی سامان خرید کر بصرہ پہنچ گیا۔ بصرہ کی بندرگاہ پہ ہر وقت جہاز آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی نام پتا لکھوایا اور ایک جہاز میں سوار ہو گیا۔

اس سفر میں بھی پچھلے سفروں کی طرح میرے ساتھ کئی اور تاجر تھے اور اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا کہ ہم ملکوں ملکوں گھومتے، پرانا سامان بیچ کر نیا خریدتے اور نئی نئی دُنیاؤں کی سیاحت کرتے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا لیکن ایک دن جب ہم کھلے سمندر میں سفر کر رہے تھے تو طوفان آ گیا۔

سمندر میں اکثر طوفان آتے رہتے ہیں۔ ایسے میں موجیں بپھر جاتی ہیں، جہاز ہلنے لگتا ہے اور ہوا کی شدت سے ہر چیز الٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ کپتان اور ملاحوں کے لیے بھی یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے، وہ جہاز کو بچانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ مسافر اور تاجر اس دوران ذکر میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ غرض وہ وقت بڑے امتحان کا ہوتا ہے۔

اس دن جب طوفان آیا تو دوپہر کا وقت تھا۔ یہ طوفان دیر تک جاری رہا۔ سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی جب ہر طرف اندھیرا چھا گیا تو ایک مصیبت یہ ہوئی کہ زوردار بارش ہونے لگی۔ اب حال یہ تھا کہ نیچے بے قرار لہریں تھیں اور اوپر سے پانی برس رہا تھا۔ ایسے میں جہاز کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا اور وہ صحیح راستے سے ہٹ کر کسی دوسری سمت میں مڑ گیا۔ طوفان کے وقت جہاز میں شور

مچا ہوا تھا۔ ہر شخص چیخ پکار کر رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور اس پر مزید یہ کہ کبھی کبھار گرج کے ساتھ بجلی چمکتی تھی جس سے ہم اور ڈر جاتے تھے۔ میں ایسے میں ایک کونے میں الگ بیٹھ گیا اور تلاوت کرنے لگا۔

ساری رات بارش جاری رہی۔ صبح جب روشنی ہوئی تو طوفان ختم ہو چکا تھا لیکن پانی پر ہر طرف ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی جس میں دُور تک کا منظر نہ دیکھا جاتا تھا۔ دوپہر تک جب سورج ذرا بلند ہو گیا تو دھند بھی چھٹ گئی اور ہم نے اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر کھلے سمندر میں پایا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں کیوں کہ اندھیرے اور طوفان کی وجہ سے ہم اپنا راستہ کھو بیٹھے تھے اور سمندر میں بھٹک کر نہ جانے کہاں آ نکلے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دُور سے خشکی کے آثار ظاہر ہوئے۔ کپتان نے مسافروں کو بتایا کہ اب ہم زمین پہ اتریں گے۔ مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن تھوڑی دیر میں ہی ان کی خوشی غائب ہو گئی جب کپتان نے انہیں یہ بتایا کہ یہ سامنے والا جزیرہ اور اس سے پیچھے کے سات جزیرے خطرناک بونوں کا مسکن ہیں۔ یہ بونے بہت خوں خوار اور فسادی ہوتے ہیں اور انسانوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر پہنچتے ہی ہم نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے انسانوں کا ایک بہت بڑا ہجوم ہماری طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ بونے تھے جنہیں کپتان نے بہت خطرناک بتایا تھا۔ ان میں سے کسی کا قد ایک گز سے زیادہ نہ تھا۔ ان کے ناخن بڑھے ہوئے اور دانت تیز تھے۔ ان کے جسم پر سرخ سرخ بال بھی تھے۔ ایک عجیب بات جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک چھوٹی سی ٹوپی سر پر لیے ہوئے تھا جو تاج کی طرح تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بونوں نے سمندر میں چھلانگیں لگائیں اور تیرتے ہوئے جہاز تک آ گئے۔ انہوں نے بادبان پھاڑ دیئے اور لنگر کی رسیاں کاٹ دیں، پھر جہاز کو گھسیٹ کر ساحل تک لے آئے اور ہمیں اترنے پر مجبور کر دیا۔

اسی دوران کپتان ہمیں مسلسل خاموش رہنے کی اور چپ چاپ بونوں کا حکم ماننے کی نصیحت کرتا رہا۔ بونے اپنے منہ سے مسلسل خوہ خوہ کی آوازیں نکال رہے تھے۔ ایک بونے نے میری عبا پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے اسے ایک طرف کیا تو اس نے اس زور سے میرے ہاتھ پر کاٹا کہ میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ اسی طرح ہمارے ایک ساتھی کا پاؤں ایک بونے کے پاؤں پر آ گیا۔ جواب میں ان نے اسے اس زور سے پنجہ مارا کہ اس کی چیخ سے سارا ماحول گونج گیا۔ چناں چہ چپ چاپ چلتے رہے، جزیرے کا درمیانی حصہ قدرے نیچا تھا اور یہاں ایک بڑا عالی شان محل بنا ہوا تھا جو ساحل سے نظر نہ آتا تھا۔

یہاں تک لا کر بونے رُک گئے اور پھر پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے۔ جب ہم سے کافی فاصلے پر پہنچ گئے تو بلند آواز سے خوہ خوہ کرنے لگے۔ یہ گویا اس بات کا حکم تھا کہ ہم محل میں چلے جائیں۔ ادھر ہم اس بات پر حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ بہر حال ہم نے محل کی طرف قدم اٹھائے اس وقت اس کے سوا کچھ نہ سوجھا کہ ہم محل میں چلے جائیں۔

محل کا صدر دروازہ آبنوس کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ یہ دروازہ بہت بڑا اور بھاری بھرکم تھا لیکن جب ہم نے اسے کھولا تو وہ آسانی سے کھلتا چلا گیا۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ سامنے ایک باغ ہے جس میں مختلف رنگوں کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ اس باغ کے چاروں طرف مختلف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ہم ان کمروں کی طرف گئے۔ کمرے بہت سارے تھے اور ان کے دروازے ایک دوسرے میں کھلتے تھے۔ سب سے بڑا کمرہ ایک ہال کی طرح تھا۔ جب اس میں پہنچے تو خون خشک ہو گیا۔ اس کمرے میں انسانی کھوپڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا اور ایک طرف گوشت بھونے کی سلاخیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ سارے کمرے میں ایک عجیب بدبو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم یہ سارا منظر دیکھ کر لرز گئے۔ حالت یہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی خوف کے مارے بات نہ کرتا تھا۔ اس دوران محل کے باہر بونوں کا شور بہت بڑھ گیا۔ ہمیں یوں لگا جیسے بونے خوشی سے ناچتے ہوئے شور کر رہے ہیں۔ کچھ دیر یوں ہی گزری۔ ہم کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی محل کی چیزوں کو دیکھتے۔ اس دوران بونوں کے شور میں اور اضافہ ہو گیا۔ پھر اچانک ایک عجیب واقعہ ہوا۔ کمرے کا دوسرا دروازہ کھلا اور ہمارے سامنے ایک بہت بڑے قد کا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی نہیں بلکہ کوئی دیو لگتا تھا۔ کھجور کے درخت جتنا لمبا قد، شعلوں جیسی آنکھیں، لمبے دانت، تیز ناخن، بڑے بڑے کان، موٹی ناک اور ہاتھ میں گرز۔ یہ اس

کا حلیہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہماری چیخیں نکل گئیں۔ وہ تھا بھی اتنا ہیبت ناک کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ اس کے منہ سے سانس کے ساتھ سیاہ رنگ کی بدبو خارج ہو رہی تھی اور یہ جو سارے ماحول میں بو پھیلی ہوئی تھی اسی کی وجہ سے تھی۔

دیو تھوڑی دیر ہم سب کو گھورتا رہا، پھر اس نے اتنی دہشت ناک آواز سے چیخ ماری کہ محل کے در و دیوار ہل گئے۔ اس کے بعد اس نے ہاتھ والا گرز اُٹھا کر اس قوت سے زمین پر مارا کہ ہم سب پلٹ کر گرے۔ پھر وہ ہمارے مزید قریب آ گیا اور لال لال آنکھوں سے ہمیں گھورنے لگا۔

میں اس کے سب سے قریب گرا پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے ایسے فضا میں اُٹھا لیا جیسے مرغی کے چوزے کو اُٹھاتے ہیں۔ پھر مجھے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میں دبلا پتلا تھا شاید اس لیے اسے پسند نہ آیا۔ چناں چہ مجھے پھینک کر اس نے ساتھ والے آدمی کو اُٹھایا اور اس کا بھی اسی طرح جائزہ لینے لگا۔ ہماری جماعت میں سب سے زیادہ موٹا آدمی ہمارا کپتان تھا۔ دیو تھوڑی دیر اس کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اسی طرح اسے اُٹھائے اُٹھائے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

وہاں جا کر اس نے آگ جلائی اور کپتان کو بھون کر کھا گیا۔ اس کے بعد وہیں لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔ ہم اس دوران زمین پر ایسے گرے پڑے تھے جیسے جان ہی نہ ہو۔ خوف کی وجہ سے ہماری بولنے کی سکت ختم ہو گئی تھی۔ ایسے واقعات پیش آ رہے تھے کہ کسی کو سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کیا کہے؟ بات کرنا تو درکنار ہم میں سے کوئی کروٹ بھی نہ بدل رہا تھا۔ دوسروں کا تو مجھے پتا نہیں البتہ میں نے یہ ساری رات کچھ سوتے، کچھ جاگتے اور کچھ ڈرتے گزاری۔ دوسری طرف دیو کے خراٹوں سے سارا محل گونجتا رہا۔

صبح جب سورج نکلا تو دیو نیند سے بیدار ہوا اور اپنی عادت کے مطابق ایک زوردار چیخ ماری، پھر دھم دھم کرتا ہوا محل کے باہر چلا گیا۔ جب اس کے قدموں کی چاپ دور ہو گئی اور ہمیں یقین ہو گیا

کہ اب وہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا تو ہم اُٹھ بیٹھے۔ تھوڑی دیر ہم نے خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر سب بے اختیار رونے لگے۔ انسان جب بہت زیادہ غمگین ہوتا ہے تو بلک بلک کر رونا وہ واحد چیز ہے جس سے اس کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ ہمارا کپتان زندگی سے جا چکا تھا۔ ہمیں اس کی موت کا شدید غم تھا۔ اسی غم میں ہمیں رونا آ رہا تھا۔

کافی دیر آنسو بہانے کے بعد جب ذرا طبیعت ہلکی ہوئی تو ہم نے ایک دوسرے کو تسلی دی اور جینے کی اُمنگ دلائی۔ اسی دوران ہمارا ایک ساتھی باہر گیا اور جڑی بوٹیاں اکٹھی کر لایا جنہیں کھا کر ہم نے زندگی کا سامان کیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کہاں وہ دن تھے کہ سب ہنستے کھیلتے سفر کر رہے تھے اور کہاں یہ وقت کہ سب کو رونا پڑ رہا تھا۔

شام کو دیو پھر آ موجود ہوا اور ہمارے ایک اور ساتھی کا وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے کپتان کا ہو چکا تھا۔ دیو اپنی بھوک مٹانے کے بعد اسی طرح خراٹے مار کر سو گیا اور ہم ایک طرف بیٹھ کر پھر سسکیاں لینے لگے۔

پھر یہ سلسلہ روزانہ ہونے لگا۔ ہمارا ایک ساتھی روزانہ دیو کی غیرانسانی بھوک پر قربان ہونے لگا اور دوسری طرف ہم مسلسل جڑی بوٹیاں کھانے کی وجہ سے کمزور ہو گئے۔ صبح کو دیو جب محل سے چلا جاتا تو ہم آپس میں کچھ بات چیت کر لیتے۔ ہم میں سے کسی کو بھی پتا نہ تھا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ ہر کسی کے دل میں عجیب بے یقینی کی کیفیت تھی۔

شوں کر رہا تھا اور اوپر ہم دونوں اپنے آپ کو شاخوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میرا ساتھی مجھ سے ذرا نیچے تھا۔ اژدھا درخت کے تنے کے سہارے اوپر اُٹھا اور بلند ہو کر اسے اُٹھا لینے میں کام یاب ہو گیا۔ خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ باقی رات خدا خدا کر کے کاٹی، صبح ہوئی تو درخت سے اترا اور ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگا کہ خدایا اب کیا کروں؟

ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اژدھا صرف رات کو باہر نکلتا تھا۔ شاید وہ ان جانوروں میں سے تھا جنھیں سورج کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔ میں جانتا تھا کہ شاید آج رات میری زندگی کی آخری رات ہو گی کیوں کہ جب اژدھا رات کو نکلے گا تو میں اس کا شکار بن جاؤں گا لیکن شاید قدرت کو مجھے ایک رات اور زندہ رکھنا منظور تھا۔

اس علاقے میں ایک چھوٹا سا پودا پایا جاتا تھا جسے چھو بوٹی کہتے ہیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ اس پودے کے قریب نہیں جاتا۔ چناں چہ میں نے کیا کیا کہ شام ہونے سے پہلے ہی بہت سے چھو بوٹی کے پودے توڑے اور انہیں درخت کے گرد پھیلا دیا۔ میں نے کچھ پودے درخت کے تنے کے ساتھ بھی مسلے اور باقی اپنے ہاتھوں، پیروں اور کپڑوں پر بھی اچھی طرح مسل لیے۔ جلد ہی چھو بوٹی کی ناگوار بدبو ہر طرف پھیل گئی۔

اس کے بعد میں پہلے کی طرح درخت پر چڑھ بیٹھا۔ رات گہری ہوئی تو اژدھا آیا لیکن درخت سے دُور رہا۔ میں شاخوں میں چھپا ہوا اس کی پھنکاریں سنتا رہا۔ صبح میں پھر اُتر کر ساحل پر آ گیا۔ زندگی میرے لیے بے رنگ ہو چکی تھی۔ تاجروں کی پوری جماعت میں بس ایک میں ہی بچا تھا اور میرا بھی کچھ پتا نہ تھا کہ زندہ بچوں گا یا نہیں۔ میں نے گڑگڑا کر دعا کی۔ اللہ تعالیٰ کو میری حالت پہ رحم آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جزیرے کے قریب سے ایک بحری جہاز گزرتے دیکھا۔

میں جھٹ سے درختوں کی شاخیں توڑ لایا اور انہیں جھنڈے کی طرح لہرا لہرا کر جہاز والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ ان لوگوں نے بھی شاید مجھے دیکھ لیا اور ایک کشتی سمندر میں اتاری جو مجھے لینے ساحل تک آ گئی۔ میں فوراً اس میں جا سوار ہوا۔ تھوڑی دیر میں ہی میں اس قاتل جزیرے سے دُور ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ جہاز والے بڑے نیک لوگ تھے۔ انہوں نے میری کہانی سن کر مجھے تسلی دی، پھر بہت عمدہ کھانا کھلایا اور میرے کپڑے بدلوائے۔

یہ جہاز افریقہ کی کسی بندرگاہ پر جا رہا تھا۔ جب ان کی منزل آئی تو انہوں نے مجھے بھی وہاں اُتار دیا۔ میں اس نئے ملک میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنے لگا۔ جلد ہی میں نے اتنے پیسے جمع کر لیے کہ بغداد جا سکوں۔

چناں چہ میں روانہ ہوا اور منزلوں پر منزلیں مارتا ہوا اپنے گھر آ پہنچا۔ اس سفر میں میں اتنا بیمار اور کمزور ہو چکا تھا کہ میرے گھر والے مجھے پہچان نہ سکے۔ جب میں نے انہیں اپنی دکھ بھری داستان سنائی تو سب اشک بار ہو گئے۔ کافی عرصہ تک میری نگہداشت کی گئی تب جا کر میری صحت بحال ہوئی۔

اس سفر میں مجھے کوئی بھی مالی نفع نہ ہوا بلکہ جو تجارتی سامان اور اشرفیاں میرے پاس تھیں وہ بھی سب لٹ لٹا گئیں۔ ☆☆☆

تھرما میٹر

تھرما میٹر عام طور پر ایک شیشے کی شفاف ٹیوب ہوتی ہے، جو پارے کے علاوہ الکحل پر مشتمل ہوتی ہے۔ شیشے کی نلی میں سرخ رنگ الکحل کو ظاہر کرتا ہے۔ الکحل اس لیے رکھا جاتا ہے کیوں کہ الکحل بھی مرکری کی طرح گرمی یا حرارت ملنے پر پھیلتی ہے۔ لہٰذا جب تھرما میٹر کو جسم پر لگایا جاتا ہے تو تھرما میٹر میں موجود الکحل حرارت ملنے پر پھیل کر ایک مخصوص سطح کو ظاہر کرتا ہے اور ہم تھرما میٹر میں الکحل کو مختلف سطحوں پر دیکھ کر حرارت معلوم کر سکتے ہیں۔ تھرما میٹر دو یونانی الفاظ Therm یعنی گرمی اور Metron یعنی پیائش کا مجموعہ ہے۔ یعنی درجہ حرارت کی پیائش کرنے والا آلہ۔ گرمی یا حرارت سے مراد کسی مادّی چیز کے ایٹموں اور سالموں کی حرکی توانائی کی مجموعی مقدار ہوتی ہے جب کہ درجۂ حرارت کا مطلب اس چیز کے ایٹموں اور سالموں کی حرکی توانائی کا اوسط ہوتا ہے۔ مرکری تھرما میٹر ایک جرمن طبیعیات گبرئیل ڈینیل فارن ہائیٹ نے ایجاد کیا۔ اس نے ایک چھوٹے سے خالی جوف میں پارہ بھر دیا اور پھر اس کے اوپر ایک باریک سوراخ والی نالی جوڑ دی۔ پھر اس نے جوف کو گرم کرنا شروع کر دیا تاکہ اس میں موجود پارہ پھیل کر نالی میں چڑھنے لگے۔ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ نالی میں چڑھنے والے پارے کی مقدار، درجۂ حرارت کے راست متناسب ہوتی ہے۔ یعنی جتنا زیادہ درجۂ حرارت ہوگا، اس نالی میں پارے کی بلندی اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ فارن ہائیٹ نے اپنے آلے کو برف میں رکھ دیا اور پھر آہستہ آہستہ گرم کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ برف پگھل کر پانی بن گئی۔ اسے برف کا نقطۂ پگھلاؤ کہتے ہیں۔ اس نے اس سطح کو 32 کا نشان لگایا۔ پھر اس نے اس آلے کو انسانی جسم کے درجۂ حرارت تک گرم کیا۔ اب پارے کی سطح مزید بلند ہوئی جسے اس نے 100 کا نشان لگایا۔ اس کے بعد سویڈن کے ماہر فلکیات اینڈرز سیلیس (Anders celsius) نے تجویز کیا کہ برف کے پگھلنے کے درجۂ حرارت کو 100 درجے اور ابلتے پانی کے درجۂ حرارت کو صفر (0) درجے شمار ہونا چاہیے۔ یعنی اب صفر برف کے نقطۂ پگھلاؤ اور 100 پانی کا نقطۂ جوش درجے میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ پیمانہ ہے جس میں برف کے پگھلنے سے پانی کے ابلنے تک 100 قدم آتے ہیں اور اس کے موجد کے نام پر "سیلیس اسکیل" بھی کہا جاتا ہے۔ ☆☆☆

اے وطن عظیم ہے تو

وطن عظیم پہ جانیں لٹا کر
یوں اپنا آشیاں بنایا ہے ہم نے
کسی کی میلی نظر برداشت نہ کریں گے
ہر میلی نظر کو گرایا ہے ہم نے
ارضِ پاک کی مٹی کو شہیدوں کے لہو سے دھو کر
اپنی مٹی کو پاک بنایا ہے ہم نے
دنیا کو عظیم مقصد حیات دے کر تہر
شجاعت کا قصہ سنایا ہے ہم نے

کاوش: ثناء سعید، گوجرانوالہ

بانو کی بلی

بانو نے اک بلی پالی آدھی گوری آدھی کالی
بھوری بھوری آنکھوں والی ریشم جیسے بالوں والی
چڑیا چوزے شوق سے کھائے دودھ پیئے اور سو جائے
پنجے بھی دکھلائی ہے کتے سے ڈر جاتی ہے
بنتی اور سنورتی ہے چوہوں پہ وہ مرتی ہے

کاوش: عفت خالدہ، راول پنڈی

غصہ

غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہو کر ندامت پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے مذہب اسلام نے بھی غصے کو حرام قرار دیا ہے کیوں کہ غصے میں انسان وہ کر بیٹھتا ہے جس کا اسے بعد میں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ غصے کی حالت میں پانی پی لیا جائے۔ کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں یا پھر وضو کر لیں پھر اس جگہ سے چلے جائیں۔ غصے نے ہی انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا ہے۔ ہمیں کسی کی بری بات سننا گوارا نہیں۔ غصے سے انسان اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ غصہ تھوک دیجیے اور ہنستے ہنساتے زندگی گزاریے۔

نرل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ

انمول رشتہ

کہنے کو تو بہن تین حرفوں کا مجموعہ ہے لیکن اپنے اندر معنی و مطالب کا ایک جہاں رکھتا ہے۔ اس کے ہر ہر حرف سے اس رشتے کی عظمت واہمیت جھلکتی ہے جیسے:

ب: سے بہادر، باہمت اور باوفا ہے۔ اوڑھے وہ نازک سی اک ردا ہے۔
ہ: سے ہمدرد، ہنرمند اور ہونہار ہے۔ کرتی وہ سب سے بے حد پیار ہے۔
ن: سے نرم دل، نیک سیرت اور نڈر ہے۔ جان اپنی وہ سب پہ کرتی نثار ہے۔
یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو لازوال ہے۔ خدا ہر ایک کی (بہن) کو سلامت رکھے۔ (آمین!)

لائبہ قریشی، راول پنڈی

انمول باتیں

☆ کبھی زندگی میں کسی کے لیے آنسو نہ بہانا کیوں کہ وہ تمہارے آنسوؤں کے قابل نہیں اور اگر وہ اس قابل ہے تو تمہیں رونے نہیں دے گا۔
☆ کبھی کسی پر کیچڑ مت اچھالنا کیوں کہ یہ تو ہوسکتا ہے کہ تمہارا نشانہ خطا ہو جائے مگر تمہارے ہاتھ ضرور گندے ہوں گے۔
☆ کبھی کسی پہ انگلی نہ اٹھانا کیوں کہ تمہاری ایک انگلی دوسرے کی طرف ہے تو تین انگلیاں تمہاری طرف ہیں۔
☆ کبھی کسی کو دھوکہ مت دینا۔ دھوکے میں بڑی جان ہوتی ہے یہ کبھی مرتا نہیں اور ایک دن آپ کے پاس واپس آ جاتا ہے کیوں کہ اسے اپنے ٹھکانے سے محبت ہوتی ہے۔

ایمان زہرہ، لاہور

اقوالِ زریں

☆ اللہ ہر پرندے کو رزق دیتا ہے لیکن اس کے گھونسلے میں نہیں ڈالتا۔
☆ ناکامی کا خوف ہی ناکامی کی بنیاد ہے۔
☆ علم بغیر عمل کے ایسا ہے جیسا بغیر روح کے جسم۔
☆ وقت اور سمندر کی لہر کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتی۔
☆ عقل کی حد ہوسکتی ہے مگر بے عقل کی کوئی حد نہیں۔
☆ مایوسی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

محمد عمر ناصر، لاہور

انسان عجیب ہے

☆ انسان بھی کتنا عجیب ہے۔ دولت کمانے کے لیے اپنی صحت گنوا دیتا ہے اور صحت کے لیے اپنی دولت گنوا دیتا ہے۔
☆ اپنے مستقبل کی فکر میں اپنا حال ضائع کر دیتا ہے اور مستقبل میں

اپنے ماضی کو یاد کر کے روتا ہے۔

☆ انسان جیتا ایسے ہے جیسے کبھی مرنا نہیں اور مرتے وقت سوچتا ہے جیسے ابھی جیا ہی نہیں۔ نجمہ شاہین، بہاولپور

اقوال سونی

☆ معاشرے پر تمہارا اس سے بڑا کوئی احسان نہیں ہو سکتا کہ تم خود سنور جاؤ۔

☆ صدقہ فقیر کے سامنے عاجزی سے باادب پیش کرو کیوں کہ خوش دلی سے صدقہ دینا قبولیت کی نشانی ہے۔

☆ دو بھائیوں میں صلح کروا دینا نماز، روزے اور صدقے سے بڑی نیکی ہے۔

☆ صبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ناپسندیدہ چیز ملنے پر اور دوسرا محبوب چیز نہ ملنے پر۔

☆ اپنے آپ کو بہتر سمجھ لینا جہالت ہے، ہر آدمی کو اپنے سے بہتر سمجھنا چاہیے۔

☆ اگر برائی کو ابتدا میں نہ روکا جائے تو وہ آہستہ آہستہ ضرورت بن جاتی ہے۔

☆ قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ عائشہ ادریس، علی پور

کام کی باتیں

☆ جو اچھی بات سنو اسے لکھ لو، جو لکھ لو اسے یاد کر لو، جو یاد کر لو اسے بیان کر دو اور جو بیان کر دو اسے کر کے دکھاؤ۔

☆ لباس کی سادگی ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔

☆ نیکی کر کے ایسے بھول جاؤ جیسے گناہ کے وقت رب کو بھولتے ہو۔

☆ تلوار دو قسم کی ہوتی ہے ایک لوہے کی اور دوسری محبت کی فرق صرف اتنا ہے کہ لوہے والی ایک کو دو کرتی ہے جب کہ محبت والی دو کو ایک کرتی ہے۔

☆ اصل یتیم وہ ہے جس کے پاس علم نہیں۔

☆ کبھی کسی دوست کو فضول مت سمجھو کیوں کہ جو درخت پھل نہیں دیتے وہ سایہ ضرور دیتے ہیں۔ محمد وحید ساگر، راولپنڈی

☆☆☆

☆ بے وقوف کے ساتھ محل میں بیٹھنے سے عقل مند کے ساتھ قید خانے میں بیٹھنا بہتر ہے۔

☆ انسان خود عظیم نہیں ہوتا بلکہ اس کا کردار اسے عظیم بناتا ہے۔

☆ اگر گناہ کرنا چاہتے ہو تو ایسی جگہ تلاش کرو جہاں اللہ نہ دیکھ سکے۔

☆ جو مصیبت تمہیں اللہ کی طرف متوجہ کر دے وہ مصیبت نہیں نعمت ہے اور جو نعمت تمہیں اللہ سے غافل کر دے وہ نعمت نہیں مصیبت ہے۔ ربیعہ عابد، لاہور

شانِ حیدری

حضرت علیؓ ایک مرتبہ اپنے غلام کے ساتھ مدینہ منورہ کے بازار میں عید کے لیے کپڑے خرید رہے تھے۔ آپؓ نے دو جوڑے لیے۔ ایک قیمتی، ریشمی اور دوسرا معمولی کھدر کا۔ آپؓ کے غلام نے شکریہ کے ساتھ کھدر کا جوڑا رکھ لیا تو آپؓ نے فرمایا: ”میرا سوٹ مجھے دے دو تمہارے لیے یہ ریشمی کپڑا خریدا ہے۔“ غلام نے عرض کیا: ”یا امیر المومنین آپؓ خلیفہ ہیں، یہ کھدر کا کپڑا کیسے پہنیں گے، آپؓ کو تو یہ ریشمی لباس سجے گا۔“ آپؓ نے فرمایا۔ ”میں بوڑھا آدمی ہوں اور تم جوان ہو۔ عید تو جوانوں کی ہوتی ہے لہٰذا یہ تم ہی پہنو گے۔“ محمد حسنات، راولپنڈی

غریب لوگ بڑے کام

☆ ڈاکٹر اے۔ کیو خان کے والد ٹیچر تھے۔

☆ جابر بن حیان ایک یتیم، غریب بچہ تھا۔ جسے دنیا کیمسٹری کا بانی مانتی ہے۔

☆ یورپ کا نام ور ترین شاعر ہومر ایک اندھا بھکاری تھا۔

☆ لولا ڈی سلوا جو بچپن میں لوگوں کے جوتے پالش کرتا تھا، دنیا آج اسے برازیل کا صدر مانتی ہے۔

☆ مشہور سائنس دان جان بیرڈ ایک غریب پادری کا بیٹا تھا۔

☆ ڈاکٹر عبدالکلام سابق صدر اور بھارت کے میزائل پروگرام کا بانی ایک معمولی اخبار فروش تھا۔ نبیہ جمیل، لاہور

سنہری باتیں

☆ کسی شخص کے چہرے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ انسان ایک بند کتاب کی طرح ہے۔ جس کا سرورق اور اندر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

☆ ستارے آسمان کی زینت ہیں اور عقل مند انسان زمین کی۔

☆ جس طرح ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس طرح انسان بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے۔

☆ زندگی کی دوڑ میں آگے نہ جانے والا انسان اس پھول کی طرح ہے جو شاخ پر آیا مگر کھل کر اپنی بہار نہ دکھا سکا۔

☆ اعتماد ہوا کے ایک جھونکے کی طرح ہوتا ہے جو ایک مرتبہ چلا جائے تو پھر واپس نہیں آتا۔ محمد ابوہریرہ، علی پور چٹھہ

اس کرۂ ارض پر بے شمار خوب صورت پرندے اور دل کش پھول پائے جاتے ہیں۔ پرندے بھی مختلف اقسام اور رنگوں میں پائے جاتے ہیں۔ چکور بھی ایک دل کش پرندہ ہے۔ چکور پاکستان کا قومی پرندہ ہے۔ چکور دنیا کے کئی ممالک میں پایا جاتا ہے۔ جن میں نیوزی لینڈ، یونان، اٹلی، شمالی امریکہ، ہاؤنا کیا (ہوائی) فرانس اور اسپین شامل ہیں۔ پاکستان، افغانستان، بھارت اور نیپال اس کے اصل وطن ہیں۔

یورپی اقوام نے چکور کو اپنے وطن میں بسانے کے لیے بہت محنت کی ہے۔1893ء میں ایک شخص ڈبلیو ابلیسیڈال وہ پہلا شخص ہے، جو کراچی سے چکور کے 5 جوڑے لے کر شمالی امریکہ پہنچا۔ بعدازاں 1951ء میں ترکی سے چکور منگائے گئے اور انہیں ایریزونا، کیلیفورنیا اور نبراسکا وغیرہ میں بسایا گیا۔ مگر یہ وہاں کے موسمی حالات کا مقابلہ نہ کر سکا۔1926ء میں کوئٹہ سے ایرانی نسل کے 19 چکور نیوزی لینڈ میں بسائے گئے۔ چکور کو انگریزی میں راک پیٹرج کہتے ہیں۔ اس کا سائنسی نام "Alectoris graeca" اس کی 27 سے زیادہ اقسام ہیں۔ مگر سرخ ٹانگوں والا ہندی چکور پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس کو مختلف زبانوں سے پکارا جاتا ہے مثلاً کبک، کیلکک، کاؤکاؤ، چکرو، زارکر، چکارا اور چکوری وغیرہ۔

اس کا وزن 19 سے 27 اونس اور مادہ چکور کا وزن 13 سے 19 اونس تک ہوتا ہے۔ چکور ایک مسحور کن آواز کا مالک ہے۔ یعنی نر اور مادہ چکور ملتے ہیں تو اس دوران "ویئو ویئو" کی آوازیں نکالتا ہے۔ شکار کے دوران "کرکر" (نر آواز) غذا کھانے کے دوران بہت تیز "تک تک" گروہ میں ہو تو "چک چک" اور "چاک چاک" کی آواز نکالتا ہے۔ عقاب کے بعد چکور وہ دوسرا پرندہ ہے جو اونچے اور فلک بوس پہاڑوں کا عاشق ہے۔2,500 فٹ سے لے کر 10,000 فٹ بلندی تک اس کے مسکن ہیں۔ حسین وادیاں، برف پوش پہاڑ، بھرے جنگلات اس کی کمزوری ہیں۔

چکور غذا میں گھاس کے پتے، جو، گندم، جوار، سیب اور آلو شوق سے کھاتا ہے۔ مادہ چکور فروری، مارچ اور اپریل میں انڈے دیتی ہے۔ اگر اس کا گھونسلہ خراب ہو جائے تو فوراً دوسرا بنا لیتا ہے اس کے انڈے لمبوترے، زرد اور دھبے دار ہوتے ہیں۔ چوزہ انڈے سے نکلنے کے بعد 12 سے 16 ہفتوں میں جوان ہو جاتا ہے۔

چکور پاکستان کے فلک بوس پہاڑوں، فاٹا کے دشوار گزار علاقوں، کشمیر اور بلوچستان کے بنجر، خشک پہاڑوں میں غول کی صورت میں اڑتے ہیں۔ چکور قدرت کا حسین شاہ کار ہے۔ یورپی ممالک میں اسے نسل خیزی کے عمل سے بھی گزارا گیا ہے۔ امریکہ کا سفید چکور پرواز میں لاثانی ہے۔ مسقط اور عمان کا چکور "بلیک ہیڈ" نایاب ہے۔

فارسی اور اردو ادب میں اس پرندے کو چاند کا عاشق تصور کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ چاندنی میں یہ کلیلیں کرتا ہے۔ چاند کی طرف لپک لپک کر اڑتا ہے اور جب بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہنس رہا ہے۔

جب پہاڑوں پر شدید برف باری ہوتی ہے تو یہ پرندہ نیچے آ جاتا ہے۔ مگر اس دوران کوے، میگپائیز، سانپ، شکرے، سنہری عقاب، سرخ عقاب، بابِ کیٹ، ر الو اور چوہے اس کی تاک میں رہتے ہیں۔ جب یہ پانی پینے کے لیے نیچے اترتا ہے تو شکاری اسے شکار کر لیتے ہیں اور پانی میں نشہ آور ادویات ملا دیتے ہیں۔ چکور کی نسل خطرے سے دوچار ہے۔ اس وقت چکور پہاڑوں کے بلند ترین سلسلوں، لداخ، نانگا پربت، ہمالائی رزوبہ، کوہ ہندوکش اور کوہ سلمان میں قدرے محفوظ ہے۔

☆☆☆

پاک سرزمین نے ہر دور میں ایسے قابل فخر سپوت پیدا کیے جنہوں نے کھیل کو پاکستان کی پہچان بنانے میں اپنا کردار ادا کیا اور وہ کھلاڑی آج بھی پاکستان سمیت دنیا بھر میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم میں بھی بہت سے کھلاڑیوں نے اپنے وقت میں صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ اگر ہم دنیا کے تمام میدانوں میں سبز ہلالی پرچم بلند کرنے والوں کی فہرست مرتب کرنے لگیں تو یہ بہت طویل ہوگی۔ ایسے ہی کھلاڑیوں میں ایک جگمگاتا نام سابق وکٹ کیپر بیٹسمین معین خان کا بھی ہے۔ وہ وکٹ کیپر کی حیثیت میں ہر لمحہ ٹیم کو متحرک کرتے نظر آئے تو دوسری جانب مایہ ناز بلے باز کے روپ میں معین خان نے کئی مواقع پر مخالف باؤلروں کی خوب پٹائی بھی کی۔

معین خان نے پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم کی نمائندگی سے لے کر قومی اسکواڈ کی قیادت تک کے فرائض جیسے تمام مراحل اپنی صلاحیتوں اور محنت سے اپنے لیے آسان کیے۔ بظاہر کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی معین خان کرکٹ سے گہرے لگاؤ اور دلچسپی کے باعث کھیل سے منسلک ہیں اور قومی کرکٹ ٹیم کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔

معین خان 23 ستمبر 1971ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا کرکٹ کیرئیر کئی برسوں پر محیط ہے۔ انہوں نے پاکستانی ٹیم کی نمائندگی کرتے ہوئے 69 ٹیسٹ میچ کھیلے۔ دائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے معین نے 104 اننگز میں 8 بار ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے 2741 رنز بنائے جن میں 4 سنچریاں اور 15 نصف سنچریاں شامل ہیں۔ معین خان کی بیٹنگ اوسط 28.55 رہی جب کہ بہترین اسکور 137 رنز رہا۔ ٹیسٹ میچز میں انہوں نے وکٹوں کے پیچھے سے 128 کیچ اور 20 اسٹمپڈ سے شکار کیا۔

ایک روزہ انٹرنیشنل میچوں میں معین خان نے 3266 رنز بنائے۔ سب سے زیادہ اسکور 72 رنز رہا۔ ایک روزہ انٹرنیشنل میچوں میں وکٹوں کے پیچھے سے انہوں نے 214 کیچ پکڑے اور 73 اسٹمپڈ سے شکار کیا۔ معین خان نے چند ٹی ٹوئنٹی بھی کھیلے۔ شروع سے لے کر آخر تک معین خان کا ریکارڈ شاندار رہا۔

یہاں معین خان کے لگائے ہوئے ایک یادگار چھکے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جس طرح شارجہ کے میدان میں جاوید میانداد کا آخری بال پر لگایا ہوا چھکا کوئی پاکستانی نہیں بھول سکتا کہ یہ پاکستان کی جیت میں بہت اہم ثابت ہوا تھا لیکن معین خان نے بھی 1992ء کے ورلڈ کپ کے سیمی فائنل میں آخری لمحات میں کیوی باؤلر کو جو چھکا لگایا تھا وہ بھی ناقابل فراموش اور یادگار ہے۔

قومی کرکٹ ٹیم میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے والے معین خان کی زندگی کا ایک اہم فیصلہ ''معین خان کرکٹ اکیڈمی'' کا

قیام ہے، جس کے مثبت اثرات یقینی طور پر قومی ٹیم پر مرتب ہوں گے۔ معین خان کرکٹ اکیڈمی کراچی میں کارپوریٹ سیکٹر کی ٹیموں کے درمیان پہلا ٹوئنٹی ٹوئنٹی کرکٹ ٹورنامنٹ 6 اگست سے 20 اگست 2011ء تک کھیلا گیا۔ اس ایونٹ کی خاص بات یہ تھی کہ جیو سوپر نے اس ایونٹ کے تمام میچ شائقین کرکٹ کے لیے براہِ راست پیش کیے۔ اس طرح جیو سوپر پر اس کی مکمل کوریج سے شائقین کرکٹ کو سنسنی خیز میچوں کے ساتھ بہترین اور باسہولت کرکٹ گراؤنڈ کے بارے میں جاننے کا بھرپور موقع ملا۔

ویسے مختلف اداروں میں 40 سال سے زائد عرصے سے کرکٹ ہو رہی ہے لیکن مسئلہ یہ رہا ہے کہ ان کی پذیرائی کرنے والا کوئی نہیں۔ معین خان کرکٹ اکیڈمی کے ذریعے یہ مثبت قدم اُٹھایا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ کارپوریٹ سیکٹر کو اپنے ساتھ ملا کر ملک میں کرکٹ کے فروغ اور باصلاحیت کھلاڑیوں کو مؤثر پلیٹ فارم فراہم کیا جائے۔ کارپوریٹ سیکٹر ٹی ٹوئنٹی جیسے ایونٹس سے کھلاڑیوں کو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور اظہار کا موقع ملا اور پھر جیو سوپر کی براہ راست نشریات نے لوگوں کو موقع دیا کہ وہ ملک کے باصلاحیت کھلاڑیوں کو ایکشن میں دیکھیں۔ ایسے ہی ٹورنامنٹس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سا ادارہ پروفیشنلی انداز میں کام کر رہا ہے اور کس ٹیم یا ادارے کے کھلاڑی ذہنی اور تکنیکی طور پر زیادہ مضبوط ہیں۔ ان نیشنل ایونٹس میں ہی اچھی پرفارمنس کا مظاہرہ کر کے کوئی بھی کھلاڑی قومی ٹیم تک جا سکتا ہے۔ اس طرح ان نیشنل ایونٹس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ قومی سطح پر کتنی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر اُبھرتے ہوئے کھلاڑیوں کی تو یہ بہت ضرورت ہیں جہاں نئے کھلاڑیوں کو سیکھنے اور اپنی پرفارمنس کو پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔

معین خان کرکٹ اکیڈمی، دراصل معین خان کا وژن (vision) تھا کہ کرکٹ سے جو کچھ سیکھا ہے اور جو تجربہ حاصل کیا ہے، اسے آگے بڑھایا جائے۔ نوجوان کھلاڑیوں کو تربیت دینا، معین خان اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کی درست تربیت، اسٹائل اور دیگر چیزوں کے بارے میں صحیح رہنمائی ہو تو وہ آگے چل کر قومی کرکٹ کا اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ جس طرح کارپوریٹ سیکٹر ٹی ٹوئنٹی جیسے ایونٹس کی وجہ سے پاکستان کا سافٹ امیج دُنیا کے سامنے آیا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کا فیڈ بیک بھی شاندار رہا ہے۔ قومی کرکٹ ٹیم کے سابق وکٹ کیپر بیٹسمین معین خان کی قائم کردہ کرکٹ اکیڈمی میں گزشتہ چند برسوں کے دوران نئے اُبھرتے ہوئے کھلاڑیوں کا رسپانس اتنا اچھا رہا ہے کہ امید کی جا سکتی ہے کہ اکیڈمی کی مزید توسیع اور دیگر پراجیکٹس پر کام کیا جائے گا تاکہ اکیڈمی کے ذریعے ایسے نوجوان اور باصلاحیت کھلاڑی سامنے آئیں جو قومی کرکٹ ٹیم کی نمائندگی کر سکیں۔ یقیناً یہ خواہش خود معین خان بھی اپنے دل میں رکھتے ہوں گے۔

معین خان قومی کرکٹ ٹیم سے تو ریٹائر ہوئے ہیں مگر آج بھی وہ قومی ٹیم کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے قومی ٹیم کے کوچ کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں اور قومی کرکٹ ٹیم کے مینیجر اور چیف سلیکٹر بھی رہے۔ بعدازاں مینیجر کا عہدہ ان سے لے کر نوید اکرم چیمہ کو دے دیا گیا اور وہ قومی کرکٹ ٹیم کے مینیجر مقرر ہو گئے۔ معین خان کے پاس قومی کرکٹ ٹیم کے چیف سلیکٹر کا عہدہ موجود ہے۔ اپنے عہدے میں رہتے ہوئے معین خان قومی کرکٹ ٹیم کا نہ صرف حصہ ہیں بلکہ اپنی اعلیٰ خدمات بھی پیش کر رہے ہیں۔

معین خان نے اپنے کرکٹ کیریئر میں اپنی صلاحیتوں کا جس طرح اور جس انداز میں مظاہرہ کیا ہے، وہ یادگار ہیں۔ انہوں نے بطور وکٹ کیپر قومی ٹیم میں اپنی اہمیت کو ہمیشہ اُجاگر کیا اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے شائقین کرکٹ کو محظوظ کیا۔ امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ ہونے والے ورلڈ کپ میں معین خان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے سابقہ معیار کو قائم رکھیں گے۔ ٹیم چیف سلیکٹر اور معین خان کرکٹ اکیڈمی سے وابستہ معین خان کل بھی توانا تھے اور آج بھی چاق و چوبند ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف ملکی ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر بھی کیا جاتا ہے۔ ☆☆☆

مہکتی کلیاں

- ☆ بُرے لوگ اچھی باتوں میں بھی بُرائی ڈھونڈتے ہیں جیسے مکھی سارے جسم کو چھوڑ کر صرف زخم پر بیٹھتی ہے۔
- ☆ تمہیں جہاں خلوص اور صداقت نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، ورنہ تنہائی تمہاری بہترین رفیق ہے۔
- ☆ ایک مسکراہٹ پتھر دل کو موم کر دیتی ہے۔
- ☆ مصائب سے مت گھبراؤ کیوں کہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔
- ☆ دُنیا کی محبت دل کا اندھیرا ہے جب کہ دین کی محبت دل کا نور ہے۔
- ☆ علم روشنی ہے اور جہالت اندھیرا ہے۔ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔
- ☆ سادگی انتہا کو پہنچ جائے تو اس سے خوب صورتی جنم لیتی ہے۔
- ☆ ایک سال میں سو دوست بنانا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ سو سال میں ایک مخلص دوست بنانا کامیابی ہے۔

سنہرے لوگ

غلام حسین میمن

ریاضی داں

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

اس ہونہار طالب علم نے اُستادوں کے درمیان تنازعہ پیدا کر دیا۔ کچھ اُستادوں کا خیال تھا کہ اس بچے کو اُردو عربی اور فارسی پڑھنا چاہیے، جب کہ کچھ اُستاد یہ چاہتے تھے کہ اسے سائنسی مضامین پڑھنے چاہئیں۔

اس طالب علم نے جامعہ عثمانیہ سے میٹرک کیا تھا۔ اب اسے بی اے کرنا تھا۔ یہ اپنے تعلیمی ادارے کا ذہین بچہ تھا جو ریاضی اور طبعیات کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اور اُردو زبان میں بھی یکساں دلچسپی رکھتا تھا، اس لیے کالج کے اساتذہ یہ فیصلہ کرنے لگے کہ اسے اب کن مضامین پر توجہ دینی چاہیے۔ اب مسئلہ یہ آن پڑا کہ سائنسی مضامین کے لیے تجربہ گاہ (لیبارٹری) کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے اسے کالج کے اوقات میں ہی سائنس پڑھائی جائے اور لسانیات (زبانوں کا علم) کے مضامین کالج کے بعد پڑھائے جائیں۔ اس طالب علم کو پڑھانے کے لیے اب اُردو عربی اور فارسی کے اساتذہ کالج کے وقت ختم ہونے کے بعد بھی بیٹھتے تھے اور اسے پڑھا کر ہی اپنے گھر جاتے تھے۔

یہ طالب علم محمد رضی الدین تھا جو 2 جنوری 1908ء کو حیدر آباد دکن کے علمی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر میں ہی اسے قرآن پاک کی تعلیم دی گئی۔ ناظرہ قرآن اس نے صرف دو سال میں ہی ختم کرلیا۔ اس کے بعد اسے دُنیاوی تعلیم کے لیے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ ذہانت اللہ نے خوب دی تھی، اس لیے اس نے پرائمری جماعتیں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیں اور پھر اسے ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے چار مینار کے قریب دارالعلوم بھیجا گیا۔ یہاں بھی اس نے اپنی ذہانت سے کام یابی کے جھنڈے گاڑے۔ اس کے ہم جماعت حیران ہوکر پوچھتے کہ تو اتنا کیسے پڑھ لیتا ہے تو جواب میں وہ صرف مسکرا دیتا۔ یہ دارالعلوم نظام حیدر آباد (حیدر آباد دکن کے منتظم) کی زیرِ سرپرستی کام کرتا تھا۔ یہاں عربی، فارسی، ریاضی، جنرل سائنس، جغرافیہ اور تاریخ کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ ان مضامین کی تکمیل پر ہی سند ملا کرتی تھی۔ قابلیت کی بناء پر اسے یہاں سے وظیفہ ملنا شروع ہوا۔

اس کی علمی کام یابی کا ذکر نظام تک پہنچا۔ اسی دوران برصغیر کی پہلی اُردو یونی ورسٹی "جامعہ عثمانیہ" قائم ہوئی۔ یہاں پر تمام مضامین اُردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ اس یونیورسٹی کا ایک کیمپس دارالعلوم میں بھی قائم ہوا۔ اس طرح محمد رضی الدین کو جامعہ عثمانیہ کے پہلے بیچ میں شامل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ یہیں سے اس نے 1921ء میں میٹرک کا اُمتحان پاس کیا۔

اس کے بعد اس نے بی اے کرنے کے لیے داخلہ لیا جس کے دوران اساتذہ کو یہ فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آئی کہ آیا اسے زبانوں کا علم پڑھنا چاہیے یا سائنسی مضامین۔ یوں اس نے اساتذہ کی خصوصی توجہ کی بدولت سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ لسانیات کے مضامین بھی پڑھے۔ 1925ء میں اس نے بی اے اوّل درجے میں پاس کیا اور یونیورسٹی کے سالانہ تقسیم انعامات/اسناد (کانووکیشن) میں چھ انعامات کا حق دار قرار پایا۔ اس کے بعد اس کا اگلا قدم ایم اے (میتھ میٹکس) تھا۔ داخلے کے دوسرے دن ہی اس کے اُستاد مناظر حسین گیلانی نے اسے بتایا کہ ریاست حیدر آباد دکن کے وزیر خزانہ سر اکبر حیدری اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ ملاقات کے دوران وزیر خزانہ نے اسے اوّل آنے پر مبارک باد پیش کی اور مشورہ دیا کہ وہ سول سروس (اعلیٰ سرکاری ملازمت) میں شامل ہو جائے۔ اس

کے انکار پر سر اکبر حیدری نے اسے بتایا کہ نظام حیدر آباد نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا ہے۔ وہ چاہے تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جا سکتا ہے۔ ان نے وظیفہ لینا پسند کیا اور اگلی منزل کے لیے کیمبرج یونیورسٹی، (لندن) کو منتخب کیا۔ اپنی تمام تر تعلیم اردو میں ہونے کے باوجود، اس نے داخلے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور یوں اسے یونیورسٹی میں سالِ اوّل کے بجائے سالِ دوم میں داخلہ ملا۔ خوش قسمتی نے ان کے یہاں بھی قدم چومے اور وہ بیسوی صدی کے ممتاز ریاضی دان اور ماہر طبیعیات پال ڈیراک کے ابتدائی شاگردوں میں سے ایک قرار پایا۔ یہاں سے اس نے آنرز کے ساتھ ایم اے ریاضی کیا۔

ریاضی کے حوالے سے شہرت پانے والے اس عظیم انسان کو ہم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے نام سے عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے جرمن زبان سیکھنا شروع کی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ مشہور سائنس دان آئن اسٹائن کی زیرِنگرانی اپنی پی ایچ ڈی مکمل کریں مگر وہ ان دنوں رخصت پر تھے۔ انہوں نے اپنا یہ کام (مقالہ) پروفیسر ورنر ہائزنبرگ کی زیرِ نگرانی مکمل کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیرس سے بھی پوسٹ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وہاں انہوں نے علمی لیکچرز بھی دیے اور ممتاز علمی جرائد میں اپنے مضامین بھی شائع کروائے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی 1931ء میں ہندوستان واپس آئے اور جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر کی ذمہ داری سنبھالی۔ 1937ء میں کوانٹم میکانیات (Quantum Mechanics) پر ان کے لیکچر کی کتاب شائع ہوئی جس کا انتساب (اپنی کتاب کسی کے نام سے منسوب کرنا) انہوں نے اپنے اُستاد پروفیسر ورنر ہائزنبرگ کے نام کیا۔ پروفیسر ورنر ہائزنبرگ نے اس پر اپنی رائے دی کہ میں نے یہ کتاب دلچسپی اور لطف لیتے ہوئے پڑھی ہے۔ اسی طرح دیگر ماہرین نے بھی کتاب کی تعریف کی۔ انہیں انڈین اکیڈمی آف سائنسز بنگلور کا فاؤنڈیشن فیلو بنا دیا گیا۔ 1937ء میں انہیں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز کا فیلو بھی منتخب کر لیا گیا۔ نیشنل اکیڈمی آف سائنسز نے انہیں 1938ء میں جواہر لعل نہرو کے ہاتھوں گولڈ میڈل سے نوازا۔

انہوں نے علامہ اقبال کی فرمائش پر آئن اسٹائن کے نظریہ اضافت پر اُردو میں پہلی اور عام فہم کتاب بھی لکھی جسے 1940ء میں انجمن ترقیٔ اُردو سے شائع کی۔ اس وقت علامہ اقبال کا انتقال ہو چکا تھا، مگر ان کی خواہش پوری ہو چکی تھی کہ کوئی آئن سٹائن کے کام کو اردو زبان میں پیش کرے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی علامہ اقبال کے علاوہ مرزا غالب اور فارسی شاعر حافظ شیرازی کے بھی بہت مداح تھے۔ انہیں فارسی، عربی، جرمنی اور فرانسیسی زبانوں پر مکمل عبور تھا۔

1950ء میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ایک وفد کے ہمراہ کراچی آئے۔ انہیں "کل پاکستان سائنس کانفرنس" میں بلایا گیا تھا۔ پاکستان آتے ہی انہیں مختلف جامعات سے وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی گئی۔ سردار عبدالرب نشتر نے انہیں جامعہ پنجاب کے لیے یہ عہدہ دینا چاہا۔ وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن نے انہیں کراچی یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی، مگر انہوں نے کہا کہ وہ صرف کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ہندوستان جا کر تدریسی خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔ اتفاقاً اسی دوران صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) کے وزیرِاعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے انہیں درۂ خیبر کے دورے کی دعوت دی۔ وہ جب پشاور پہنچے تو انہیں وزیرِاعلیٰ کے دفتر سے دو خطوط ملے۔ پہلے خط میں حکومتِ ہندوستان کو بھیجے جانے والے ٹیلی گرام کی نقل تھی۔ یہ ٹیلی گرام حکومتِ ہندوستان کو بھیجا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اب پاکستان میں ہی رہیں گے لہٰذا ان کے عزیز و اقارب کو پاکستان بھیج دیا جائے اور دوسرا خط ان کے پشاور یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر اور ڈائریکٹر تحقیق کی تعیناتی سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر صاحب دونوں خطوط سے لاعلم تھے۔ خان عبدالقیوم خان کے جلدی میں بھیجے گئے ٹیلی گرام کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی ہندوستان میں تمام جائیداد ضبط کر لی گئی جس میں قیمتی کتابوں کی ایک لائبریری بھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب عمر بھر اس پر افسوس کرتے رہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اسی کتب خانے میں ریاضی، طبیعیات اور لسانیات کے علاوہ جرمن، فارسی اور فرانسیسی زبان میں زبردست علمی ذخیرہ تھا، اگر وہ پاکستان پہنچ جاتا تو یہاں کے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوتا۔

انہوں نے پشاور یونیورسٹی میں درس و تدریس شروع کی۔ تین سال بعد وہ اس جامعہ کے وائس چانسلر بنا دیے گئے۔ ان کے دور میں اس کا خوب صورت کیمپس اور کئی پروفیشنل کالج قائم ہوئے۔ انہوں نے یہاں کے معیار کے لیے سخت جدوجہد کی اور کئی بین الاقوامی ماہرین کو بچوں کی تعلیم کے لیے بلایا۔

1960ء میں علامہ آئی آئی قاضی کے بعد وہ سندھ یونیورسٹی

کے انکار پر سر اکبر حیدری نے اُسے بتایا کہ نظام حیدر آباد نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا ہے۔ وہ چاہے تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جا سکتا ہے۔ اس نے وظیفہ لینا پسند کیا اور اگلی منزل کے لیے کیمبرج یونیورسٹی (لندن) کو منتخب کیا۔ اپنی تمام تر تعلیم اُردو میں ہونے کے باوجود اس نے داخلے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور یوں اسے یونیورسٹی میں سالِ اوّل کے بجائے سالِ دوم میں داخلہ ملا۔ خوش قسمتی نے ان کے یہاں بھی قدم چومے اور وہ بیسوی صدی کے ممتاز ریاضی دان اور ماہر طبیعیات پال ڈیراک کے ابتدائی شاگردوں میں سے ایک قرار پایا۔ یہاں سے اس نے آنرز کے ساتھ ایم اے ریاضی کیا۔

ریاضی کے حوالے سے شہرت پانے والے اس عظیم انسان کو ہم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے نام سے عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے جرمن زبان سیکھنا شروع کی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ مشہور سائنس دان آئن اسٹائن کی زیرنگرانی اپنی پی ایچ ڈی مکمل کریں مگر وہ ان دنوں رخصت پر تھے۔ انہوں نے اپنا یہ کام (مقالہ) پروفیسر ورنر ہائزنبرگ کی زیرنگرانی مکمل کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیرس سے بھی پوسٹ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وہاں انہوں نے علمی لیکچرز بھی دیے اور ممتاز علمی جرائد میں اپنے مضامین بھی شائع کروائے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی 1931ء میں ہندوستان واپس آئے اور جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر کی ذمہ داری سنبھالی۔ 1937ء میں کوانٹم میکانیات (Quantum Mechanics) پر ان کے لیکچر کی کتاب شائع ہوئی جس کا انتساب (اپنی کتاب کسی کے نام سے منسوب کرنا) انہوں نے اپنے اُستاد پروفیسر ورنر ہائزنبرگ کے نام کیا۔ پروفیسر ورنر ہائزنبرگ نے اس پر اپنی رائے دی کہ میں نے یہ کتاب دلچسپی اور لطف لیتے ہوئے پڑھی ہے۔ اسی طرح دیگر ماہرین نے بھی کتاب کی تعریف کی۔ انہیں انڈین اکیڈمی آف سائنسز بنگلور کا فاؤنڈیشن فیلو بنا دیا گیا۔ 1937ء میں انہیں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز کا فیلو بھی منتخب کر لیا گیا۔ نیشنل اکیڈمی آف سائنسز نے انہیں 1938ء میں جواہر لعل نہرو کے ہاتھوں گولڈ میڈل سے نوازا۔

انہوں نے علامہ اقبال کی فرمائش پر آئن اسٹائن کے نظریہ اضافت پر اُردو میں پہلی اور عام فہم کتاب بھی لکھی جسے 1940ء میں انجمن ترقیِ اُردو نے شائع کی۔ اس وقت علامہ اقبال کا انتقال ہو چکا تھا، مگر ان کی خواہش پوری ہو چکی تھی کہ کوئی آئن سٹائن کے کام کو اُردو زبان میں پیش کرے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی علامہ اقبال کے علاوہ مرزا غالب اور فارسی شاعر حافظ شیرازی کے بھی بہت مداح تھے۔ انہیں فارسی، عربی، جرمنی اور فرانسیسی زبانوں پر مکمل عبور تھا۔

1950ء میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ایک وفد کے ہمراہ کراچی آئے۔ انہیں "کل پاکستان سائنس کانفرنس" میں بلایا گیا تھا۔ پاکستان آتے ہی انہیں مختلف جامعات سے وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی گئی۔ سردار عبدالرب نشتر نے انہیں جامعہ پنجاب کے لیے یہ عہدہ دینا چاہا۔ وزیر تعلیم فضل الرحمٰن نے انہیں کراچی یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی، مگر انہوں نے کہا کہ وہ صرف کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ہندوستان جا کر تدریسی خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔ اتفاقاً اسی دوران صوبہ سرحد (موجود خیبر پختونخواہ) کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے انہیں درۂ خیبر کے دورے کی دعوت دی۔ وہ جب پشاور پہنچے تو انہیں وزیر اعلیٰ کے دفتر سے دو خطوط ملے۔ پہلے خط میں حکومت ہندوستان کو بھیجے جانے والے ٹیلی گرام کی نقل تھی۔ یہ ٹیلی گرام حکومتِ ہندوستان کو بھیجا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اب پاکستان میں ہی رہیں گے لہٰذا ان کے عزیز و اقارب کو پاکستان بھیج دیا جائے اور دوسرا خط ان کے پشاور یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر اور ڈائریکٹر تحقیق کی تعیناتی سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر صاحب دونوں خطوط سے لاعلم تھے۔ خان عبدالقیوم خان کے جلدی میں بھیجے گئے ٹیلی گرام کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی ہندوستان میں تمام جائیداد ضبط کر لی گئی جس میں قیمتی کتابوں کی ایک لائبریری بھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب عمر بھر اس پر افسوس کرتے رہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اس کتب خانے میں ریاضی، طبیعیات اور لسانیات کے علاوہ جرمن، فارسی اور فرانسیسی زبان میں زبردست علمی ذخیرہ تھا، اگر وہ پاکستان پہنچ جاتا تو یہاں کے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوتا۔

انہوں نے پشاور یونیورسٹی میں درس و تدریس شروع کی۔ تین سال بعد وہ اس جامعہ کے وائس چانسلر بنا دیے گئے۔ ان کے دور میں اس کا خوب صورت کیمپس اور کئی پروفیشنل کالج قائم ہوئے۔ انہوں نے یہاں کے معیار کے لیے سخت جدوجہد کی اور کئی بین الاقوامی ماہرین کو بچوں کی تعلیم کے لیے بلایا۔

1960ء میں علامہ آئی آئی قاضی کے بعد وہ سندھ یونیورسٹی

کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ اس کی علمی فضاء میں بہتری کے لیے انہوں نے کئی کانفرنس، سیمینار اور دوسری تقریبات کا انعقاد کیا۔

1964ء میں صدر ایوب خان نے انہیں اسلام آباد میں نئی تعمیر ہونے والی یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا۔ انہوں نے اس جامعہ کے قیام اور معیار کے لیے سخت جدوجہد کی اور بالآخر قائداعظم یونیورسٹی وجود میں آئی اور وہ اس کے وائس چانسلر بنے۔ یہاں انہوں نے پروفیسر شپ کے لیے پی ایچ ڈی کی قابلیت لازمی قرار دی تھی۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کئی علمی اور سائنسی اداروں سے منسلک رہے۔ پاکستان آنے سے قبل انڈین اکیڈمی آف سائنسز کے نائب صدر رہے۔ 1947ء سے 1949ء تک وہ انڈین میتھ میٹیکل سوسائٹی کے بھی صدر رہے۔ اسی دوران یونیسکو میں سائنس کے خصوصی مشیر بھی رہے۔

وہ پاکستان میں اکیڈمی آف سائنسز کے باغبان میں سے ایک تھے۔ 1961ء تا 1972ء تک وہ اس اکیڈمی کے چیئر مین رہے۔

وہ کئی دیگر بین الاقوامی اداروں اور انجمنوں کے رکن اور فیلو بھی رہے۔ 1952ء میں انہیں ریاضی کی بین الاقوامی یونین کی قومی کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا اور مسلسل 20 سال تک یہ اعزاز ان کے پاس رہا۔ 1960ء میں حکومت پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ 1962ء میں فیڈرل ری پبلک آف جرمنی نے انہیں گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف میرٹ کا اعزاز دیا جو جرمنی کے سربراہ (چانسلر) کے ہاتھوں ملا۔ 1975ء میں ایک اور اعزاز ان کے حصے میں آیا۔ انہیں انٹرنیشنل کانگریس آف میتھ میٹیکل سائنسز کا جنرل پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ 1981ء میں حکومتِ پاکستان نے ہلالِ امتیاز عطا کیا۔ جامعہ عثمانیہ نے اپنی 50 سالہ گولڈن جوبلی تقریبات میں انہیں ''ممتاز سابق استاد'' کا ایوارڈ دیا۔

2 جنوری 1998ء کی صبح عین اپنی سال گرہ والے دن یہ عظیم اُستاد، دانش ور اور سائنس کا ماہر، ریاضی دان ہم سے بچھڑ گیا۔ اسلام آباد کے مرکزی قبرستان میں ان کی تدفین کی گئی۔ ☆☆☆

کھوج لگائیے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

غازی خان، محمد حمزہ، فیصل آباد۔ تحریم احمد، واہ کینٹ۔ محمد سمیع اللہ، اوکاڑہ۔ شریم اشرف غوری، اسلام آباد۔ اجر خان، نوشہرہ۔ مصقد خان، کراچی۔ ماہم ظفر، لاہور۔ عائشہ خان، لاہور۔ سعد ندیم، لاہور۔ ابراہیم ولی، لاہور۔ حافظ عبید اللہ، لاہور۔ جواد احمد، کراچی۔ حافظ عبیداللہ شہباز، لاہور۔ محمد باسط، کراچی۔ تجمیع الحسن، لاہور کینٹ۔ محمد فیضان ارشد، تاندلیانوالہ۔ حمزہ خوش نود، لاہور۔ صفاء تصور، میرپور آزاد کشمیر۔ عبیداللہ ملک، اٹک سٹی۔ عبداللہ سعود، فیصل آباد۔ حامد علی قادری، محمد عمر عطا قادری، محمد نبیل قادری، نور حسین قادری، کاموکے۔ حافظ محمد منیب، وزیرآباد۔ فائزہ رضا، گجرات۔ آصف کمال، پشاور۔ نادر علی، کراچی۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ ناظرہ مقدس، شیخوپورہ۔ بی بی حاجرہ، ہری پور۔ سیدہ فاطمہ، فیصل آباد۔ تطہیر زاہرہ، راول پنڈی۔ دشمہ خان، لاہور۔ محمد تنویر، کراچی۔ محمد عثمان، کاموکے۔ فاطمہ آفرین، گوجرانوالہ۔ محمد عمر رضوان، کراچی۔ حسن عبداللہ، لاہور۔ کرن فاروق، گوجرانوالہ۔ ماہم ناصر خان، لاہور۔ عالیہ خان، بہاول پور۔ عبدالسلام، بہاول پور۔ عبدالواحد، بہاول پور۔ محمد عثمان، وزیرآباد۔ محمد علی قاسمی، وزیرآباد۔ مزمل حسین، وزیرآباد۔ عائشہ نعیم، لاہور۔ اذکی عبدالرحمٰن، لاہور۔ محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد زکوان، بہاول پور۔ محمد وردان، بہاول پور۔ ناعمہ تحریم، کراچی۔ محمد ذیبان، بہاول پور۔ طیبہ طاہر، جھنگ۔ فیضان احمد، لاہور۔ محمد حاشر، لاہور۔ علی عبداللہ، فیصل آباد۔ حامد رضا، بہاول پور۔ عبدالرحیم، جھنگ صدر۔ طلحہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ شاہ زیب خرم، لاہور۔ طلحہ ظفر انصاری، وزیرآباد۔ شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ نجل لیاقت، سیال کوٹ۔ مریم عبدالسلام شیخ، نواب شاہ۔ ازما قمر، لاہور۔ زہرہ نسیم، شورکوٹ۔ طوبیٰ زاہرہ۔ جھنگ صدر۔ ضیاء الدین، لاہور۔ وردہ زہرہ، جھنگ صدر۔ فاطمہ زاہد، ٹیکسلا۔ حافظ محمد عثمان ثانی، لاہور۔ دانیہ نوید ملک، لاہور۔ اقراء منور، گوجرانوالہ۔ رمیشہ نور، اسلام آباد۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ محمد ریحان احمد، اسلام آباد۔ زوہیب احمد قریشی، فیصل آباد۔ عبدالرحمٰن، لاہور۔ عروہ جاوید وڑائچ، بہاول نگر۔ ایمان زہرہ، لاہور۔ تماضر ساجد، صادق آباد۔ اقصیٰ شمشیر، کراچی۔ صفا رشید، کراچی۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ گلشن اسلم، میرپور آزاد کشمیر۔ رجاب زبیر، شیخوپورہ۔ محمد ابرار، کراچی۔ بنت عبدالواحد، لاہور۔ منیبہ شہباز، لاہور۔ چوہدری سلطان سرفراز، ملتان۔ عثمان منور، کراچی۔ حسیب جاوید، کراچی۔ محمد مرشد صدیق، کراچی۔ مریم جاوید، لاہور۔ نفیس صدیقی، لاہور۔ عدیل صدیقی، سرگودھا۔ عبداللہ رفیع، لاہور۔ اریب ظفر، لاہور۔ علی حنظلہ بھٹہ، راول پنڈی۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔ ثمرہ غفار، رحیم یار خان۔ مناہل شاہد، راول پنڈی۔ عیشتہ رضیہ، لاہور۔ راضیہ نعیم، راول پنڈی کینٹ۔ نازیہ ندیم، راول پنڈی کینٹ۔ محمد اسامہ ملک، راول پنڈی۔ حمزہ اکرام، جہلم۔ رضوان اشہد، پشاور۔ اسامہ ظفر راجہ، جہلم۔ محمد اعجاز، کراچی۔ کشف طاہر، ملتان۔

ہدایت کا راستہ

شانزے گل، لاہور

ننھے اسجد نے دادا ابو کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر ان کی تقلید کرتے ہوئے قرآن کی تلاوت بھی کی۔ پھر وہ اپنی چھوٹی بہن عائشہ کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اسجد پانچویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ ایک ہونہار طالب تھا۔ آج کل رمضان میں اس کا معمول کچھ یوں تھا کہ دن کو ٹیوشن جاتا، واپس آ کر اپنی بہن کے ساتھ کھیلتا، پھر ہوم ورک کرتا اور اسی دوران افطار کا وقت ہو جاتا۔ رمضان میں تو وہ اپنے دادا ابو کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ نماز اور قرآن بھی پڑھا کرتا تھا۔

ایک دن اسجد کو اسکول میں مس اسلامیات پڑھا رہی تھیں۔

"آپ میں سے سورۃ فلق کس کس کو آتی ہے؟" مس نے سب بچوں سے پوچھا۔ تقریباً تمام بچوں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ مس نے عالیہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جھٹ سے کھڑے ہو کر اپنا اسکارف درست کیا اور ہاتھ باندھ کر سورۃ فلق سنا دی۔ مس نے اس کو شاباش دی اور پھر اسجد کو کھڑا کیا۔ "اسجد اب آپ ان آیات کا مفہوم بھی بتا دیں۔" مس نے مسکراتے ہوئے اسجد سے پوچھا۔ وہ گھبرا گیا کیوں کہ اسے ترجمہ نہیں آتا تھا۔ "مس مجھے نہیں آتا۔" اسجد نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "کوئی بات نہیں بیٹا! آپ بیٹھ جائیے۔" مس سمجھ گئیں کہ وہ باترجمہ قرآن نہیں پڑھا کرتا۔ "کلاس میں کسی اور کو ان آیات کا مفہوم پتا ہے؟" مس نے سب بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کچھ بچوں نے کاپیوں میں منہ چھپا لیا، کچھ نے بستے میں کچھ تلاش کرنا شروع کر دیا اور جنہیں اور کچھ نہ سوجھ آیا، انہوں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ غرض کسی نے ہاتھ کھڑا نہ کیا۔ مس کو افسوس ہوا کہ یہ ننھے بچے قرآن کی تلاوت تو کرتے ہیں مگر مفہوم سے ناآشنا ہیں۔

"کوئی بات نہیں بچو! آپ لوگ گھبرائیں نہیں، مفہوم تو میں آپ کو بتا دیتی ہوں مگر آج سے آپ نے کوشش کرنی ہے کہ آپ قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھیں، اس سے آپ کو علم ہوگا کہ اللہ دراصل ہم سے کہنا کیا چاہ رہا ہے۔ جب آپ کو اللہ کے احکامات کا علم ہوگا تبھی تو آپ ان پر عمل کر سکو گے۔" مس نے پیار سے ننھے بچوں کو سمجھایا۔ "مس ہم پکا وعدہ کرتے ہیں کہ اب قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھیں گے۔" سب بچوں نے پُرعزم لہجے میں یک زبان ہو کر کہا۔

گھر واپس آتے ہی اسجد اپنے دادا ابو کے کمرے میں گیا۔ "ابو میں اندر آ جاؤں؟" اسجد نے دروازے پہ کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔

"جی بیٹا!" دادا ابو اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

"دادا ابو، مجھے آپ سے ایک بات کہنی تھی۔" اسجد نے کہا۔

"ہاں بولو بیٹا! کیا بات ہے؟" دادا ابو نے پوچھا۔

"دادا ابو مجھے قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھنا ہے تاکہ مجھے سمجھ آئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں۔ جب تک مجھے یہ نہیں پتا ہوگا، میں اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بچہ کیسے بنوں گا؟" اسجد نے معصومیت سے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے، بیٹا! آج سے میں خود اپنے بچے کو ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھاؤں گا۔ جیتے رہو میرے بچے۔" دادا ابو اپنے ننھے پوتے کی بات سن کر بہت خوش ہوئے اور ساتھ میں انہیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم صرف قرآن پڑھنے کو کافی سمجھتے ہیں جب کہ ترجمے کی طرف شاذ و نادر ہی غور کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج ہم مسلمان اسلام کی تعلیمات سے نابلد ہیں۔ انہوں نے قرآن کو خود بھی سمجھنے اور اپنے اسجد کو سمجھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اٹھے اور ننھے اسجد کو الماری سے ایک چاکلیٹ نکال کر انعام کے طور پر دی۔ دراصل یہ اس رہنمائی کا شکریہ تھا جو ان کے معصوم فرشتے نے کی تھی۔ اسجد تو چاکلیٹ لے کر خوش ہو گیا تھا، اسے ابھی اندازہ نہ تھا کہ اس نے چھوٹی سی عمر میں ہدایت کے راستے پر چلنے کا عزم کیا تھا۔

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

ایک غلطی

نوریہ مدثر، سیالکوٹ

نوریہ بہت اچھی بچی تھی۔ وہ اپنے والدین کی نہایت فرماں بردار اور اساتذہ کی سعادت مند طالبہ تھی۔ میٹرک میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے پر اس کو "موبائل" کا تحفہ ملا، وہ بھی اس شرط پر کہ نوریہ موبائل کو بے تحاشا استعمال نہیں کرے گی۔ چوں کہ

نورینہ پڑھنے والی بچی تھی اس لیے اپنا دھیان موبائل اور موبائل گیمز پر نہیں دیتی تھی۔ کالج جانے کے بعد اس کے معمول میں تبدیلی آ گئی۔ پہلے وہ ہر شام کچن میں اپنی امی کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ لیکن اب کالج سے آ کر سونا، پھر ٹیسٹ اور اسائنمنٹ تیار کرنا اور پھر آدھا گھنٹہ ٹی وی دیکھنا۔ اس کی امی کو لگا کہ شاید پڑھائی کا زیادہ بوجھ ہے، اس لیے انہوں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ایک دن کالج میں سپورٹس گالا کا انعقاد کیا گیا۔ نورینہ جب کلاس میں پہنچی تو اس کی دوستوں رمشا، عالیہ اور نازش نے کہا۔ ''دیکھو نورینہ! ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ کل ہم سب اپنے اپنے موبائل لائیں گے۔ تم نے بھی اپنا موبائل لے کر آنا ہے۔''

نورینہ پریشان ہوتے ہوئے بولی: ''پاگل ہو گئے ہو کیا؟ اگر کسی ٹیچر نے پکڑ لیا تو؟ خود سوچو، ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔''

''اوہو، میری بھولی دوست، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ دیکھو! ساری ٹیچرز تو انتظامات میں مصروف ہوں گی تو کون دیکھے گا۔ ویسے بھی ہم نے تو بس سب کی گروپ فوٹو ہی لینی ہے۔ کون سا کوئی غلط کام کرنا ہے۔'' عالیہ نے کہا۔ نورینہ نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! ٹھیک ہے، میں تم لوگوں کے کہنے پر لا رہی ہوں۔''

اگلے دن نورینہ نے امی کو بتائے بغیر موبائل بیگ میں رکھا اور کالج چلی گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ''نہیں، نہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے تو بس گروپ فوٹو لینی ہے۔'' یہ کہہ کر نورینہ نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

کلاس میں پہنچ کر ابھی نورینہ نے موبائل ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ اس کی کیمیا کی ٹیچر مس نازیہ کلاس میں داخل ہوئیں۔ نورینہ کا رنگ فق سے اڑ گیا۔ ٹیچر نے اس کے ہاتھ سے فون کھینچا اور اپنے ساتھ لے گئیں۔ ''نورینہ روتے ہوئے بار بار مس نازیہ سے معافی مانگ رہی تھی۔ مس نازیہ نے کہا۔ ''دیکھو بیٹا! بے شک آپ کی نیت غلط کام کرنے کی نہیں تھی، لیکن آپ کا طریقہ تو غلط تھا ناں۔ آپ نے والدین کو بتائے بغیر ایسا کیا۔ بیٹا! آپ ایک لائق بچی ہیں۔ مجھے امید ہے آج کے بعد آپ اپنا ہر کام کرنے سے پہلے اپنے والدین کو آگاہ کریں گی اور اب آپ کا فرض ہے کہ اپنی دوستوں کو بھی راہِ راست پر لائیں کیوں کہ دوست وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کی بہترین رہنمائی کرے۔ یہ لو اپنا موبائل۔''

نورینہ نے آئندہ کالج کے قانون کی خلاف ورزی کرنے سے توبہ کر لی۔

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

نظرِ رحمت

عفیفہ جبین طاہر، گجرات

احمد اور فرہاد کے کمرے سے لڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دونوں بھائی کافی دیر سے ایک معمولی سی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ ''یہ گھڑی میری ہے۔'' احمد نے فرہاد سے گھڑی کھینچتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، یہ گھڑی میری ہے۔ پاپا نے سال گرہ پر مجھے گفٹ کی تھی۔'' فرہاد نے احمد سے گھڑی چھین لی۔ ''کیا ہوا؟ اگر یہ گھڑی تمہاری ہے تو...... اس پر کون سا تمہارا نام لکھا ہے۔'' احمد بھی اس سے برابر لڑ رہا تھا۔ کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

ابھی وہ لڑنے میں مصروف تھے کہ اچانک پاپا کمرے میں داخل ہوئے۔ ''کیا ہوا؟ کیوں شور مچا رکھا ہے؟'' پاپا نے رعب دار آواز میں کہا۔ دونوں فوراً خاموش ہو گئے اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے وہ بہت شرمندہ ہیں۔ ''کیا بات ہے، فرہاد کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟'' اس بار پاپا کے لہجے میں کسی قدر نرمی تھی۔ ''پاپا! یہ گھڑی جو سال گرہ پر آپ نے مجھے گفٹ کی تھی، احمد مجھ سے چھین رہا ہے۔'' فرہاد نے اپنی بے گناہی ثابت کی۔ ''پاپا میں صرف تھوڑی دیر کے لیے یہ گھڑی پہننا چاہتا تھا مگر......'' احمد خوف کے مارے اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ ''بس اتنی سی بات تھی۔ احمد! اگر آپ کو گھڑی چاہیے تھی تو آپ مجھے کہہ دیتے۔ میں آج ہی آپ کو نئی گھڑی لا دوں گا۔ اب خوش......'' پاپا یہ کہہ کر باہر چلے گئے۔

شام کو جب پاپا گھر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ احمد اور فرہاد ابھی تک ناراض ہیں۔ پاپا نے پیار سے دونوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''بچو! چھوٹی چھوٹی باتوں پہ جھگڑنا اچھی بات نہیں۔ اس سے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ انسان کی عزت کرو اور اس سے محبت کرو کیوں کہ ہر انسان کے اندر خدا کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہوتی ہے۔''

پاپا چہرے پر مسکراہٹ لیے کمرے سے جانے لگے تو اچانک احمد نے پاپا کو آواز دی۔ پاپا نے مڑ کر دیکھا تو احمد کہنے لگا۔ ''پاپا! آپ بھی تو چچا جان سے ناراض ہیں۔ اگر آپ ان کو معاف نہیں کریں گے تو اللہ آپ کے نامۂ اعمال پہ بھی نظرِ رحمت نہیں فرمائے گا۔''

اگلے دن اچانک دروازے پر بیل بجی۔ احمد نے دروازہ کھولا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دروازے پر چچا جان اور چچی جان کھڑے تھے۔ یعنی اس رات پاپا نے چچا جان کو معاف کر دیا تھا۔ پاپا نے چچا جان کو گلے سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد سب لان میں چائے کی ٹیبل پر بیٹھ کر گپ شپ لگانے لگے۔

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

شناخت

عدنان ملک، نوشہرہ

عادل کو خدا نے بیسیوں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لیتا تھا۔ کھیل میں وہ سب سے آگے تھا۔ وہ اپنی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ خطاطی اور مصوری بھی اچھی کرتا تھا۔ وہ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑی دل چسپی سے حصہ لیتا تھا۔ اس کے پاس معلومات کا ایک وسیع خزانہ تھا۔ دلائل و حقائق سے وہ ہر ایک کو شکست سے نوازتا تھا۔ تجربات و تحقیقات اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور سب اسے نیوٹن، آئن سٹائن، گلیلیو، پاسکل، رابرٹ ہوک وغیرہ جیسے القابات سے پکارتے تھے۔ کچھ لڑکے تو عادل کا اصل نام تک نہیں جانتے تھے۔

عادل ان القابات سے بالکل خوش نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اساتذہ اور طلباء اس کو اس نام سے پکاریں مگر وہ مجبور تھا۔ جب کوئی اسے ان القابات میں سے کسی لقب سے پکارتا تو وہ دل میں خفا ہو جاتا تھا۔

''یار شیکسپیئر! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' عزیز نے پوچھا۔

''آپ نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے یار۔'' عادل نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' زبیر نے پوچھا۔

''یار آپ مجھے نیوٹن، آئن سٹائن گلیلیو، پاسکل وغیرہ جیسے ناموں سے کیوں پکارتے ہو۔ مجھے مت پکارو ان ناموں سے۔ اگر پکارنا ہے تو بوعلی سینا، الخوارزمی، ابن الہیثم، البیطار جیسے عظیم سائنس دان کے ناموں سے پکارو۔ جن لوگوں نے علم کی بنیاد رکھی ہے، ہم ان کے نام تک بھول گئے اور جنہوں نے مسلمانوں کے ناموں کو چھپا کر اپنے نام پیدا کیے، ان کو جانتے ہو۔'' عادل جذباتی ہو رہا تھا۔

''لیکن ان سائنس دانوں نے بھی تو کارنامے کیے ہیں۔'' سلیم نے کہا۔

''ہاں! میں مانتا ہوں کہ انہوں نے کارنامے کیے ہیں مگر انہوں نے یہ علوم مسلمانوں سے سیکھے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سائنس دانوں کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ یہ تو ہماری پہچان ہیں اور ان سے ہماری شناخت ہے مگر...... مگر ہم ہیں کہ سمجھتے نہیں۔'' عادل نے ایسے دلائل پیش کیے کہ کسی کو انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

''اچھا، مجھے بتاؤ کہ نیوٹن کب پیدا ہوا؟'' عادل نے ضیاء سے پوچھا۔

''1642ء کو۔'' ضیاء نے جواب دیا۔

''گڈ اور ڈاکٹر عبدالقدیر؟'' عادل نے دوبارہ پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' ضیاء نے سوچ کر کہا۔

''یہی تو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔ اگر پہلے سائنس دان ہم سے جدا ہو گئے اور ان کے کارنامے، شناخت اور کتابیں سب کچھ دوسروں کے پاس چلا گیا تو آج کے جو ہمارے قومی ہیرو ہیں ان کی شناخت کو کم از کم قائم رکھیں۔ انہیں کے ہماری شناخت ہے اور ہمیں ان کو یاد رکھنا چاہیے۔'' عادل نے وضاحت کی۔

''اچھا بھئی! ہماری سمجھ میں آ گیا ہے۔ اب بس بھی کرو۔'' ایوب نے مذاق کے انداز میں کہا۔

''صحیح ہے لیکن اگر آج کے بعد مجھے کسی لقب سے پکارنا ہے تو......!'' عادل نے بات مکمل نہیں کی کہ بلال بول پڑا۔

''سمجھ گئے ناں یار! بس اب چپ کرو۔ اسمبلی کا وقت ہو گیا ہے۔'' اتنے میں اسمبلی کی گھنٹی بجی۔

''چلو، البیرونی صاحب! اسمبلی کے لیے۔'' حماد نے عادل سے کہا تو عادل مسکرایا۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار

بنت عبدالحلیم، فیصل آباد

آسمان پہ تارے تاریک رات میں اپنی بہاریں دکھا رہے تھے مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آج کا دن بڑی مشکل سے گزرا تھا۔ ''رات کتنی جلدی گزر گئی۔'' آج میں نے خود سے ہی سوال کیا۔ میری ساری رات شکوے کرتے گزری تھی کیوں کہ آج میں ہار گئی تھی۔ بچپن سے مجھے پاک فوج میں بطور انجینئر کام کرنے کا شوق تھا اور اسی جنون میں میرے دن رات گزر رہے تھے مگر دوست احباب اور عزیز و اقارب کے اصرار پر انٹر میں بائیالوجی کا مضمون مجھے رکھوا دیا گیا تھا۔ اسی لیے میں بہت اداس تھی۔ ایف ایس سی کے

یہ دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ میں نے نیا عزم باندھا کہ میڈیکل کے شعبے کے ذریعے فوج میں چلی جاؤں گی۔ میں نے دن رات محنت کی۔

''صدف، صدف کدھر ہو تم؟'' مہک نے آواز لگائی اور وہ اخبار دکھایا جس میں آرمی ٹیسٹ کی معلومات درج تھیں۔ میں نے فارم پُر کر کے بھیج دیے۔ آخرکار ایک دن ٹیسٹ کا بلاوا آ گیا۔ اس دن تو پاؤں زمین پہ نہ ٹکتے تھے۔ ٹیسٹ کے مرحلے کے بعد انٹرویو۔ یہ کام ذرا مشکل تھا۔ مجھے سو فیصد امید تھی کہ میں سلیکٹ ہو جاؤں گی۔ اگلے دن مہک نے مجھے ٹیلی فون پہ بتایا کہ اس کا انتخاب ہو گیا مگر کامیاب امیدواروں میں میرا نام درج نہیں تھا۔ میری مایوسی کا کیا عالم ہوگا، آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ واصف علی واصف ایک جگہ کہتے ہیں: ''جو کرتا ہے، اللہ کرتا ہے اور جو اللہ کرتا ہے بہترین کرتا ہے۔''

گھر والوں نے میری ڈھارس بندھائی، میں نے مزید محنت کی اور دوبارہ انٹری ٹیسٹ دے ڈالا۔ لاہور کے ایک میڈیکل کالج میں میرا انتخاب ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماضی پہ گرد پڑ گئی اور بچپن کا خواب پورا نہ ہو سکا، یہ میں نہ بھلا پائی۔

آج میڈیکل کالج میں میرا آخری دن تھا۔ میں تقسیم اسناد کی تقریب میں جا رہی تھی اور مہک کے پانچ برس پہلے کہے جملے میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔

''صدف تم آرمی میں ہی جا کر قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہو ناں تو تم وہ گوہر نایاب بن جاؤ جس کی قیمت ہی نہیں ہوتی، یعنی پاکستان سے محبت کا اظہار صرف فوج میں شامل ہونا نہیں بلکہ جہاں موقع ملا، وہاں اپنی خدمات صرف کر دینا۔''

اب وقت آ گیا تھا کہ میں پاکستان کے لیے خدمت کر سکوں اور اپنی مٹی کا قرض اُتاروں۔ اگر جذبے سچے ہوں اور ہمت جوان ہو تو ناممکن چیز بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ پیارے وطن کی خدمت کی لگن ہو تو یہ مت سوچیں کہ کسی خاص طریقے سے وطن کی خدمت کرنی ہے۔ اپنے وطن سے محبت کا اظہار سڑک پر پڑے فضول کاغذ کو اٹھا کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہے جذبۂ جنوں تو ہمت نہ ہار — جستجو جو کرے وہ چھوئے آسمان

پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب

☆☆☆

معلومات

- انسان کے خون کے سرخ خلیے صرف بیس سیکنڈ میں پورے جسم کا ایک چکر لگا لیتے ہیں۔
- انسان کا دل دھڑکتے وقت اتنا دباؤ پیدا کرتا ہے جو کہ خون کو تیس فٹ دُور پھینک سکتا ہے۔
- پیغمبروں کی سرزمین فلسطین کو کہتے ہیں۔
- پھولوں کا ملک ہالینڈ کہلاتا ہے۔
- ہمنگ برڈ دُنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ ہے۔
- کینگرو ایک چھلانگ میں 30 فٹ کا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔
- سعودی عرب میں کوئی سینما نہیں ہے۔
- اگر سو پاور کا بلب مسلسل دس گھنٹے جلتا رہے تو اس سے بجلی کا ایک یونٹ خرچ ہوگا۔ (زینب، عدن سجاد، جھنگ صدر)
- کوے کی عمر 100 سال سے زیادہ ہوتی ہے۔
- شترمرغ واحد پرندہ ہے جس کی کھال سے چمڑا بنتا ہے۔
- جھینگا مچھلی کے خون کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔
- چھپکلی کا دل ایک منٹ میں ایک ہزار مرتبہ دھڑکتا ہے۔
- سکندرِ اعظم کے گھوڑے کا نام بوسیفلس تھا۔
- سارس ایک ایسا پرندہ ہے جو گونگا ہے بول نہیں سکتا ہے۔
- پیری گرائن فالکن 124 میل فی گھنٹا کی رفتار سے دُنیا کا سب سے تیز رفتار پرندہ ہے۔
- ہدہد ایسا پرندہ ہے جو آسمان کی بلندیوں پر اُڑتے ہوئے زیرِ زمین پانی کا میٹھا یا کڑوا ہونا معلوم کر لیتا ہے۔ (محمد حارث سعید، بورے والا)
- 16 دسمبر 1811ء میں اتنا شدید زلزلہ آیا کہ دریائے مس سی کا کچھ حصہ اُلٹی طرف بہنے لگا۔
- ایمازون رین فارسٹ (Amazon Rain Forest) دُنیا کی 20 فیصد آکسیجن پیدا کرتے ہیں۔
- یورپ وہ واحد براعظم ہے جس میں کوئی صحرا نہیں ہے۔
- دیوارِ چین چاند سے بھی نظر آتی ہے۔
- دُنیا کی سب سے بڑی سونے کی کان الاسکا امریکہ میں واقع ہے۔
- سویڈن میں ایک ہوٹل مکمل برف سے بنایا گیا۔ اس کو ہر سال دوبارہ تعمیر کیا جاتا ہے۔
- فرانس میں ہر سال ''چوروں کا میلہ'' منایا جاتا ہے جہاں لوگوں کو اسٹالوں سے چوری کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔
- آتش فشاں 50 کلومیٹر کی رفتار سے راکھ اُگل سکتا ہے۔

(مصدق سعود، کہوٹہ)

کھڑ کھاند میوزیکل گروپ

فتح محمد عرشی

گنجے والا پر آج کل موسیقی کا بھوت سوار تھا۔ جب دیکھو، بھوت بنگلے پر ریاض کرتا دکھائی دیتا تھا۔ آواز بھی ماشاء اللہ غضب کی پائی تھی۔ چشم بددور صور اسرافیل کا نمونہ پیش کرتی تھی اور اس پر ہارمونیم ایسے بجاتے تھے کہ یہ مشہور ضرب المثل صادق آتی تھی:

''میں اور گاتا ہوں اور میرا طنبورا اور گاتا ہے!''

اور جو کلام گاتے تھے، اس کا تو مت ہی پوچھیں...... کبھی بلھے شاہ کا عارفانہ کلام یا پروین شاکر کی کوئی غزل تختۂ ستم بن گئی تو خیر...... ورنہ باقی جو کلام گاتے تھے، اس کی مثال بقول مرزا غالب کچھ یوں تھی۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا
کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

چھوٹے والا اس کا ہم نوا تھا۔ چھوٹے والا اور میوزک......؟ بات کچھ حلق سے نہیں اترتی تھی۔ اس راز سے پردہ اٹھانے کے لیے کھڑ کھاند گروپ کو بھی مجبوراً دلچسپی لینا پڑی تھی۔

چنانچہ ایک دن گنجے والا اور چھوٹے والا اپنی بے سُری آواز کا جادو جگا رہے تھے کہ کھڑ کھاند گروپ نے اچانک چھاپا مار دیا۔

''مبارکاں مبارکاں...... کتنی خوف ناک آواز پائی ہے۔ میں تو ریکارڈ کر کے لے جاؤں گا اور محلے کے بچوں کو ڈراؤں گا۔'' مبارکاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

گنجے والا نے اسے گھور کر دیکھا تو اس کی بولتی بند ہو گئی۔

''میں تو مذاق کر رہا تھا یار!''

دادا بڈی نے حیران ہو کر کہا: ''آخر آپ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی روزی میں بھنگ ڈالنے کے درپے کیوں ہو گئے ہیں؟''

''ارے بے وقوفو......! بات تو سنو......'' گنجے والا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''آج کل اس دھندے میں بڑا پیسہ ہے۔ دیکھتے نہیں، ہر ایرا غیرا، نتھو خیرا کلاکار بن بیٹھا ہے!''

کھڑ کھاند گروپ نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا، اب چھوٹے والا کی میوزک میں دلچسپی کا راز کھلا تھا۔

''اچھا اچھا...... تو آپ لکشمی کے چکر میں ہیں!'' دادا بڈی نے قہقہہ لگایا۔

ملنگی کے کان کھڑے ہو گئے: ''اوہو! تو اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے، کون ہے یہ لکشمی؟''

''ارے کھامڑ! لکشمی کا مطلب ہے دولت، ڈالر، روکڑا...... کیا سمجھے؟'' دادا بڈی نے اسے ڈانٹا۔

''مبارکاں مبارکاں...... تو آج سے ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، میں ڈھولک بجاؤں گا۔'' مبارکاں ڈالر کا سن کر اچھل پڑا تھا۔

ملنگی نے کہا۔ ''اور میں طبلہ بجاؤں گا...... ایسے!'' یہ کہہ کر اس نے گنجے والا کے سر پر ہلکی سی تھاپ لگانے کی کوشش کی لیکن گنجے والا اس کے خطرناک ارادے کو بھانپ کر غوطہ لگا گیا۔

''بھلا میرے سوا ہارمونیم پر کون بیٹھ سکتا ہے۔'' دادا بڈی نے اکڑتے ہوئے کہا۔

''میرے ذمے تو نئے نوٹوں کی تقسیم لگا دو، اس کام میں ماہر ہوں۔'' چھونے والا نے خیالی نوٹ ہوا میں اُچھالتے ہوئے کہا۔

''اوکے...... ڈن!'' گنجے والا نے کہا۔ ''ہمارے گروپ کا نام ہوگا...... کھڑکھاند میوزیکل گروپ!''

''میرے خیال میں تو ''آثارِ قیامت میوزیکل گروپ'' مناسب رہے گا۔'' ہارکاں شرارت سے باز نہیں آنا تھا۔

''کھڑکھاند میوزیکل گروپ......'' چھونے والا نے نعرہ لگایا۔

''زندہ باد!'' سب نے اس زور سے نعرے کا جواب دیا کہ عجوبہ پرندے بھی ڈر کر اپنے نشیمن سے باہر نکل آئے۔

(عجوبہ پرندوں کا قصہ آپ کو پھر کبھی سنائیں گے۔)

☆......

کھڑکھاند گروپ کو ریاض کرتے کرتے ایک مہینہ ہو گیا تھا لیکن ابھی تک کسی نے بھی ان کا میوزیکل شو کروانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ آخر قدرت کو کھڑکھاند گروپ پر رحم آ گیا۔ ہوا یوں کہ ملنگی کے ایک دُور پار کے رشتہ دار کی شادی آ گئی اور ملنگی ان کے سر ہو گیا کہ آپ کھڑکھاند میوزیکل گروپ کو ''خدمت'' کا موقع دیں۔

ہر چند کہ وہ کھڑکھاند گروپ کو بلا کر اپنی شامت کی دعوت نہیں دینا چاہتے تھے لیکن گنجے والا کی اس پیش کش نے انہیں لاجواب کر دیا کہ چونکہ ہمارا پہلا شو ہے، اس لیے ہم مفت پرفارم کریں گے۔ صرف وہ رقم ہماری ہوگی جو عوام ہم پر برسائے گی۔ اس کے علاوہ نئے نوٹ بھی ہم خود لائیں گے۔

اب ان کے پاس اقرار کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

......☆......

میوزک شو کا شان دار انتظام کیا تھا۔ اسٹیج رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ گنجے والا نے آغاز حمد سے کیا اور پھر اچانک ایک دکھی غزل شروع کی۔ یہ راز صرف کھڑکھاند گروپ کو معلوم تھا کہ غزل کے بہانے وہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔

ہے ہم پہ یہ بھاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ!
یہ جاں گرمی سے ہاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ!
کہاں بجلی پدھاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ!
ہر اک مچھر شکاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ!
پریشاں رات ساری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ!
میری بیگم تو صلواتیں سنا کر سو چکی کب کی
میرے بیٹے نے اُٹھ کر ایسی بھاں بھاں کی کہ حد کر دی
مگر شاباش بیگم کو کہ اس کی آنکھ نہ جھپکی
اُٹھا کر لوریاں بیٹے کو دوں گا، میری مجبوری
یہی قسمت ہماری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ!

''واہ جی واہ...... کیا بات ہے!'' ایک شور مچ گیا۔ کئی ''زن گزیدہ شوہر'' تو جوش میں آ کر بھنگڑا ڈالنے لگے، کئی نے گنجے والا پر نوٹوں کی بارش کر دی۔

پہلی غزل ہی سپرہٹ ثابت ہوئی تھی، پھر تو کھڑکھاند میوزیکل گروپ کی بلے بلے ہوگئی۔

جب پروگرام عروج پر تھا تو اچانک گنجے والا نے عارفانہ کلام شروع کر دیا۔

''علی دم دم دے اندر...... علی دا پہلا نمبر''

اچانک ایک ملنگ ٹائپ آدمی اُٹھا اور دھمال شروع کر دی۔ لمبی لمبی زلفیں اور لمبی لمبی ڈاڑھی۔ وہ شاید علی کا ملنگ تھا۔ پروگرام کا لطف دوبالا ہو گیا۔ ملنگی نے طبلے پر تھاپ تیز کر دی۔

پھر اچانک وہ ہو گیا، جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ''علی کے ملنگ'' نے اچانک ''یا علی مدد!'' کا فلک شگاف نعرہ لگایا اور پتا نہیں کہاں سے ایک خنجر برآمد کر کے اسے ہوا میں لہراتا ہوا اسٹیج پر حملہ آور ہوا اور خنجر کے پے در پے وار کر کے ڈھولک کے پرخچے اُڑا دیے۔ کھڑکھاند میوزیکل گروپ اسٹیج چھوڑ کر چیختا چلاتا ہوا بھاگا۔ طبلے باجے وہیں رہ گئے لیکن چھونے والا رقم والا بیگ اُٹھانا نہ بھولا تھا۔

اگلے دن ملنگی سوز و ساز تو لے آیا لیکن جب رقم والا بیگ کھولا گیا تو یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ آدھے نوٹ جعلی تھے، بیس ہزار تو گنجے والا خود لے کر گیا تھا۔ کچھ فنکار قسم کے لوگ اصلی نوٹ چھونے والے سے لے کر نقلی نوٹ اُڑاتے رہے۔ چنانچہ اب اصلی نوٹ گنے گئے تو صرف چودہ ہزار تھے، ڈھولک کا نقصان الگ اُٹھانا پڑا

تھا۔ کھڑکھاند گروپ نے چھوٹے والا کا جو حشر کیا، وہ تو کیا، لیکن گنجے والا نے آئندہ کے لیے گلوکاری سے توبہ کر لی۔

اب اس گروپ کا دوسرا حال بھی سنیے:

کھڑکھاند گروپ لوکل بس میں اس حال میں داخل ہوا کہ دادا بڈی اور گنجے والا نے ایک بڑا سا بیگ اُٹھایا ہوا تھا۔ اندر جا کر گنجے والا کا منہ بن گیا۔ اس نے چلا کر کنڈکٹر سے کہا:

''اوئے چھوٹے! بس میں جگہ نہیں ہے کیا؟''

کنڈکٹر نے ہنس کر کہا: ''بس میں جگہ کہاں جناب..... جگہ بیچ کر ہی تو بس خریدی ہے۔''

''نامعقول انسان.....!'' گنجے والا بڑبڑا کر رہ گیا۔

اچانک بس ایک سٹاپ پر رُکی تو کچھ سواریاں اُتر گئیں۔ اس طرح کھڑکھاند گروپ کو بھی بیٹھنا نصیب ہوا تو اچانک ملنگی اور مبارکاں نے چونک کر کہا: ''ارے، چھوٹے والا کدھر گیا؟''

''شش..... چپ رہو!'' [illegible] ہوئے کہا۔

''مگر کیوں..... چھوٹے والا آخر گیا کہاں؟ [illegible] نکلے تھے۔'' ملنگی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''خاموش! اب اگر آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گا۔'' دادا بڈی نے غرا کر کہا۔

اس سے پہلے کہ ملنگی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا، کنڈکٹر کرایہ لینے کے لیے نازل ہو گیا۔

گنجے والا نے فوراً ہی چار افراد کا کرایہ ادا کر دیا۔ کنڈکٹر نے مشکوک نظروں سے جمبو سائز بیگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور اس بیگ کا کرایہ..... اس میں ہے کیا؟''

''ہمارا سامان ہے، اور کیا گولہ بارود لے کے جا رہے ہیں طالبان کے پاس۔'' گنجے والا نے بُرا مان کر کہا۔

''چلو خیر جو بھی ہے..... کرایہ تو آپ کو دینا پڑے گا۔'' کنڈکٹر بھی ٹلنے والا نہیں تھا۔

''اچھا..... آدھا کرایہ دے دیتے ہیں، تم بھی کیا یاد کرو گے!'' دادا بڈی نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔

''ذرا اس کا وزن تو چیک کر لیں۔'' کنڈکٹر بھی بڑا کائیاں تھا۔ یہ کہہ کر اس نے بیگ کو اُٹھانے کی کوشش کی اور چلا اُٹھا۔

''اُف..... اس کا وزن تو پوری ایک سواری جتنا ہے۔ نہ بابا نہ..... میں تو پورا کرایہ لوں گا۔''

دادا بڈی اور گنجے والا نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر گنجے والا نے بیگ کی زپ کھولتے ہوئے کہا: ''چھوٹے والا، باہر آ جاؤ۔ جب پورا کرایہ دینا ہے تو بیگ میں سفر کرنے کا کیا فائدہ؟''

اور پھر دوسرے ہی لمحے چھوٹے والا بیگ سے نکل کر اپنی ہڈی پسلی سہلا رہا تھا۔ بس مسافروں کے قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ ان میں سب سے بلند قہقہے مبارکاں اور ملنگی کے تھے۔

پھر خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا جسے اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ صورت آدمی نے توڑا۔ وہ اچانک اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور اس نے سفید ہی رنگ کے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

''[illegible] بھائیو.....!'' اس نے بس کے مسافروں کو مخاطب کیا تو اس [illegible] لرزو تھا۔ تمام مسافر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ بزرگ صورت آدمی کہہ رہے تھے:

''[illegible] تعلق وانا سے ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، وہاں آج کل پاک فوج دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کر رہی ہے۔ ہمارا خاندان بھی اس آپریشن میں پاک فوج کے ساتھ تھا۔ میں نے اپنے تین جوان بیٹے پاک وطن پر قربان کر دیے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''اب میں چاہتا ہوں کہ اپنی جان بھی اس پاک سرزمین پر نچھاور کر دوں، جس دھرتی نے مجھے ماں بن کر پالا ہے۔''

بس آفرین آفرین اور مرحبا مرحبا کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔

بزرگ صورت آدمی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

''لیکن ایک بارِ امانت میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہے۔ یہ میری جوان بیٹی ہے، اگر کوئی شریف نوجوان اس سے شادی کر لے تو میں سکون سے واپس جا کر اپنی جان اپنے پیارے وطن پر قربان کر دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی ایک شٹل کاک برقعے میں ملبوس ایک خاتون اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مکمل طور پر باپردہ!

سارے مسافر بہت متاثر نظر آ رہے تھے لیکن بزرگ صورت آدمی کا بوجھ اُتارنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

اچانک ملنگی کو جوش آیا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بزرگ صورت آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "جناب والا! اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی لختِ جگر مجھے سونپ دیں، میں اپنی جان سے بھی بڑھ کر اس کا خیال رکھوں گا۔"

سارا کھڑ کھاند گروپ حیران رہ گیا۔ گنجے والا نے ہولے سے ملنگی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "جذباتی نہ بنو! آج کل لوگ سو طرح سے دھوکا اور فراڈ کرتے ہیں۔"

سارے کھڑ کھاندیوں نے اسے بہتیرا سمجھایا لیکن ملنگی بزرگ صورت آدمی کی تقریر سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اچانک ایک بچی ڈاڑھی والا نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔ "نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے...... آیئے میں آپ کا نکاح پڑھا دوں!" اور پھر چلتی بس میں ہی ملنگی کا اس نیک پروین سے نکاح ہو گیا تھا۔ کھڑ کھاند گروپ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

اچانک ایک اور آدمی کھڑا ہوا اور کہا: "جناب، یہ مٹھائی ویسے تو میں اپنے گھر والوں کے لیے لے جا رہا تھا لیکن اس مبارک موقع پر آپ کا منہ میٹھا کرانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ لو جی، اس خوشی میں میری طرف سے منہ میٹھا کریں!"

یہ کہہ کر اس نے مسافروں میں گلاب جامن اور رس گلے تقسیم کرنے شروع کر دیے۔ ہر کسی نے خوشی خوشی سے کھائے لیکن ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ مسافروں کے سر گھومنے لگے اور پھر کچھ ہی دیر بعد سارے مسافر بے ہوشی کی دلدل میں اُتر چکے تھے۔ صرف بزرگ صورت آدمی، اس کی بیٹی، نکاح خواں اور مٹھائی تقسیم کرنے والا آدمی ہوش میں تھے کیوں کہ انہوں نے خود مٹھائی نہیں کھائی تھی۔ نکاح خواں شاید ڈرائیور بھی تھا، کیوں کہ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور اب بس کو ایک لنک روڈ پر موڑ لیا تھا...

بزرگ صورت آدمی نے اپنی سفید ڈاڑھی اُتار کر پھینک دی اور قہقہہ لگا کر کہا۔ "ارے نُورا...... اب تم بھی برقعہ اُتار دو، کب تک لڑکی بنے رہو گے!"

پھر برقعے کے اندر سے ایک خوف ناک شکل کا آدمی نکل آیا تھا۔ اگر ملنگی اپنی "شریکِ حیات" کو اس روپ میں دیکھ لیتا تو یقیناً صدمے سے بے ہوش ہو جاتا۔ شکر ہے پہلے سے بے ہوش پڑا تھا۔ بس لنک روڈ پر تھوڑی ہی دور جا کر رُک گئی تھی۔ ڈرائیور ڈاکو نے اُچھل کر پیچھے آتے ہوئے کہا:

"آداب اطمینان سے مال اسباب جمع کریں۔"

وہ چاروں قہقہے لگاتے ہوئے بے ہوش مسافروں کو لوٹنے لگے۔ بیس منٹ بعد جب ڈاکو اپنا کام تقریباً مکمل کر چکے تھے، اچانک ایک گرج دار آواز سن کر ان کی جان نکل گئی۔

"خبردار! اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لو، ہری اپ!" بس کے دونوں دروازوں سے پولیس اندر داخل ہو چکی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد ڈاکو حیران و پریشان ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے کھڑے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پولیس کو اطلاع کس نے دی؟ سب مسافروں کو بھی ہوش میں لایا جا چکا تھا۔

اچانک پولیس انسپکٹر نے کہا: "تم میں سے دادا بڈی کون ہے؟"

دادا بڈی آگے بڑھا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر کہا:

"خادم کو دادا بڈی کہتے ہیں!"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی...... سارے مسافر بے ہوش ہو گئے تھے لیکن آپ......؟" انسپکٹر نے حیران ہو کر جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"وہ اس لیے جناب کہ میں نے مٹھائی کھائی ہی نہیں تھی کیوں کہ اس وقت میرے منہ میں چیونگم تھی۔ جب سب بے ہوش ہو گئے تو میں بھی جھوٹ موٹ بے ہوش ہو گیا اور 15 پر ایمرجنسی کال بھی کر دی۔" دادا بڈی نے مزے لے لے کر بتایا۔

"ویل ڈن، دادا بڈی ویل ڈن!" پولیس انسپکٹر نے شاباش دی۔ "پولیس کافی دنوں سے اس ڈکیت گروپ کی تلاش میں تھی۔ یہ ڈکیتی کی کئی وارداتیں کر چکے ہیں۔ ان شاء اللہ آپ کو ایس پی صاحب کی طرف سے انعام ملے گا اور تعریفی سند بھی!"

"بہت بہت شکریہ جناب!" دادا بڈی نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

اچانک چھوٹے والا نے نعرہ لگایا۔ "دادا بڈی!"

سب مسافروں نے مل کر جواب دیا۔ "زندہ باد!"

مبارکاں دادا بڈی کے کان میں کہہ رہا تھا: "مبارکاں مبارکاں...... آپ تو ہیرو بن گئے۔ اب آپ پر آ گئی مرغی...... اسی خوشی میں!!!!"

مدیرِ تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میں پچھلے پانچ سال سے تعلیم و تربیت کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ مجھے اس میں شائع ہونے والی تمام کہانیاں اور نظمیں پسند ہیں۔ میں اس میں چھپنے والی کہانیاں اپنے چھوٹے بھائیوں کو سناتی ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس میں چھپنے والے مضامین سے میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ (عروج نوید)

یہ خط لکھتے ہوئے مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھتی ہوں۔ میں آپ کی نئی قاریہ ہوں۔ جنوری کا شمارہ بہت عمدہ تھا۔ محاورہ کہانی اور دیگر کہانیاں بھی ٹاپ پر تھیں۔ (کائنات ملک، واہ کینٹ)

میں تیسری بار خط لکھ رہی ہوں۔ میں نے دو کہانیاں بھیجی ہیں۔ اگر میری کہانیاں اچھی نہیں ہیں تو بتا دیں۔ میں اور محنت کروں گی۔ مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ میری لکھائی کیسی ہے؟ (لائبہ کنول، پشاور)

☆ پیاری لائبہ! آپ کہانیوں کے سلسلے میں ٹیلی فون پر رابطہ کریں اور لکھائی پر مزید توجہ دیں۔ پسندیدگی کا شکریہ!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ کئی مہینوں سے میرا خط شائع نہیں ہوا۔ اس میں نظمیں اور غزلیں بھیجی ہیں۔ میں بہت اداس تھی۔ اب ایک موہوم سی امید پر لکھ رہی ہوں، کیوں کہ امید پر دُنیا قائم ہے۔

☆ پیاری ایمان زہرہ! نظموں، غزلوں کے لیے ایک سلسلہ نظم بہ نظم ہے جس میں آپ اپنی نظمیں بھیج سکتے ہیں۔

میرا نام عروبہ ہے۔ میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں اسے دل چسپی سے پڑھتی ہوں۔ تعلیم و تربیت ہمیں دیر سے ملتا ہے۔ (عروبہ، نواب شاہ)

کیسی ہیں آپ؟ میں مسلسل تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے ضرور شائع کریں گی۔ تمام کہانیاں عمدہ اور دل چسپ تھیں۔ (ربیعہ عارف، لاہور)

میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو نیا سال مبارک! میری دعا ہے کہ تعلیم و تربیت دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

(صفاء رشید، کراچی)

☆ آپ نے بہت پیارا سا رنگین خط لکھا ہے۔ بہت بہت شکریہ!

میری طرف سے پوری ٹیم کو سلام۔ میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ جنوری کا شمارہ اپنے عروج پر تھا۔ کھڑکھاند گروپ، پرواز اور جذبہ بے حد پسند آئیں۔ آپ کا ہر شمارہ سبق آموز ہوتا ہے۔

(راضیہ نعیم، راول پنڈی)

اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین! میں دوسری جماعت سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ اب اللہ کے فضل سے آئی ٹی پروفیشنل بن چکی ہوں۔ آپ جاسوسی کہانیوں کا سلسلہ بھی شروع کریں۔ (ثناء ناز، رجانہ)

اس ماہ کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں معیاری تھیں۔ میں تعلیم و تربیت کی خاموش قاریہ ہوں۔ یہ رسالہ 1997ء سے ہمارے گھر آ رہا ہے۔ میری چھوٹی بہن بہت شوق سے یہ رسالہ پڑھتی ہے۔ اس کے مطالعے سے میری اُردو بہت اچھی ہو گئی ہے۔

(سدرہ مسعود، راول پنڈی)

☆ پیاری سدرہ! آپ نے بہت محبت سے رنگا رنگ خط لکھا۔ اس کے لیے بہت شکریہ!

تعلیم و تربیت ایک عمدہ رسالہ ہے۔ میں تین سال سے پڑھ رہی ہوں۔ اس دوران بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جنوری کے شمارے میں نئے سال کا تحفہ، ہدایت اور جذبہ اچھی کہانیاں تھیں۔ آپ کو نیا سال مبارک ہو۔ (شفق فاطمہ، راول پنڈی)

تعلیم و تربیت کا ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ جنوری کا سرورق بہت پیارا تھا۔ نئے سال کا تحفہ، کھڑکھاند گروپ، سندباد کا سفر، اجنبی، ہدایت ٹاپ پر تھیں۔ نقطے ملائیں میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ تعلیم و تربیت بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے مفید ہے۔ اس ماہ میری ٹیچر کی سال گرہ ہے۔ انہیں ضرور مبارک باد دیں۔

(حفصہ اعجاز، بازہ ہملٹ)

☆ آپ کی ٹیچر صاحبہ کو سال گرہ مبارک ہو اور ان کے لیے بہت سی دعائیں۔

میں تعلیم و تربیت پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ جنوری کا

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میں پچھلے پانچ سال سے تعلیم و تربیت کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ مجھے اس میں شائع ہونے والی تمام کہانیاں اور نظمیں پسند ہیں۔ میں اس میں چھپنے والی کہانیاں اپنے چھوٹے بھائیوں کو سناتی ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس میں چھپنے والے مضامین سے میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ (عروج نوید)

یہ خط لکھتے ہوئے مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھتی ہوں۔ میں آپ کی نئی قاریہ ہوں۔ جنوری کا شمارہ بہت عمدہ تھا۔ محاورہ کہانی اور دیگر کہانیاں بھی ٹاپ پر تھیں۔ (کائنات ملک، واہ کینٹ)

میں تیسری بار خط لکھ رہی ہوں۔ میں نے دو کہانیاں بھیجی ہیں۔ اگر میری کہانیاں اچھی نہیں ہیں تو بتا دیں۔ میں اور محنت کر لوں گی۔ مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ میری لکھائی کیسی ہے؟ (لائبہ کنول، پشاور)

☆ پیاری لائبہ! آپ کہانیوں کے سلسلے میں ٹیلی فون پر رابطہ کریں اور لکھائی پر مزید توجہ دیں۔ پسندیدگی کا شکریہ!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ کئی مہینوں سے میرا خط شائع نہیں ہوا۔ اس میں نظمیں اور غزلیں بھیجی ہیں۔ میں بہت اداس تھی۔ اب ایک موہوم سی امید پر لکھ رہی ہوں، کیوں کہ امید پر دنیا قائم ہے۔

☆ پیاری ایمان زہرا! نظموں، غزلوں کے لیے ایک سلسلہ مختصر مختصر ہے جس میں آپ اپنی نظمیں بھیج سکتے ہیں۔

میرا نام عروبہ ہے۔ میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں اسے دل چسپی سے پڑھتی ہوں۔ تعلیم و تربیت ہمیں دیر سے ملتا ہے۔ (عروبہ، نواب شاہ)

کیسی ہیں آپ؟ میں مسلسل تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے ضرور شائع کریں گی۔ تمام کہانیاں عمدہ اور دل چسپ تھیں۔ (ربیعہ عارف، لاہور)

میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو نیا سال مبارک! میری دعا ہے کہ تعلیم و تربیت دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

(صفاء رشید، کراچی)

☆ آپ نے بہت پیارا سا رنگین خط لکھا ہے۔ بہت بہت شکریہ!

میری طرف سے پوری ٹیم کو سلام۔ میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ جنوری کا شمارہ اپنے عروج پر تھا۔ کھٹ کھاند گروپ، پرواز اور جذبہ بے حد پسند آئیں۔ آپ کا ہر شمارہ سبق آموز ہوتا ہے۔

(راضیہ نعیم، راول پنڈی)

اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین! میں دوسری جماعت سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ اب اللہ کے فضل سے آئی ٹی پروفیشنل بن چکی ہوں۔ آپ جاسوسی کہانیوں کا سلسلہ بھی شروع کریں۔ (ثناء ناز، رجانہ)

اس ماہ کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں معیاری تھیں۔ میں تعلیم و تربیت کی خاموش قاریہ ہوں۔ یہ رسالہ 1997ء سے ہمارے گھر آ رہا ہے۔ میری چھوٹی بہن بہت شوق سے یہ رسالہ پڑھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے میری املا بہت اچھی ہو گئی ہے۔

(سدرہ مسعود، راول پنڈی)

☆ پیاری سدرہ! آپ نے بہت محبت سے رنگا رنگ خط لکھا۔ اس کے لیے بہت شکریہ!

تعلیم و تربیت ایک عمدہ رسالہ ہے۔ میں تین سال سے پڑھ رہی ہوں۔ اس دوران بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جنوری کے شمارے میں نئے سال کا تحفہ، ہدایت اور جذبہ اچھی کہانیاں تھیں۔ آپ کو نیا سال مبارک ہو۔ (شفق فاطمہ، راول پنڈی)

تعلیم و تربیت کا ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ جنوری کا سرورق بہت پیارا تھا۔ نئے سال کا تحفہ، کھٹ کھاند گروپ، سندباد کا سفر، اجنبی، ہدایت ٹاپ پر تھیں۔ نقطے ملائیں میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ تعلیم و تربیت بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے مفید ہے۔ اس ماہ میری ٹیچر کی سالگرہ ہے۔ انہیں ضرور مبارک باد دیں۔

(خنساء اعجاز، بارہ ہملٹ)

☆ آپ کی ٹیچر صاحبہ کو سال گرہ مبارک ہو اور ان کے لیے بہت سی دعائیں۔

میں تعلیم و تربیت پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ جنوری کا

شمارہ زبردست تھا۔ اجنبی، نئے سال کا تحفہ، بہت اچھی تھیں۔
(منیبہ عمر، اسلام آباد)

کیسی ہیں آپ؟ جنوری کا شمارہ بہت ہی اچھا تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ہیروں کی وادی، رشتے احساس کے، ہدایت اور کھڑ کھاند گروپ بہت پسند آئیں۔ لطیفے بھی پسند آئے۔ تعلیم و تربیت ایک اچھا رسالہ ہے، اس سے بچوں میں مطالعے کا شوق بڑھتا ہے۔
(رانیہ نوید ملک، لاہور)

میں سات سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں اور پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ پلیز! میرا خط ضرور شائع کریں۔ میں نے دو کہانیاں بھیجی ہیں۔ یہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں؟ (یٰسین ظہور)

واہ! ایک سے بڑھ کر ایک...... تعلیم و تربیت کی داد دینی پڑے گی۔ جنوری کا شمارہ زبردست اور لاجواب تھا۔ ہر مہینے بے چینی سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ اس بار کہانیاں دل چسپ لگیں۔ تمام لطائف مزے دار تھے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ محاورہ کہانی، سنہرے لوگ میرے پسندیدہ کارنر ہیں۔ سندباد کا سفر ٹاپ پر تھا۔ مجھے سیر و سیاحت کا شوق ہے۔ (محمد مامون احمد، فیصل آباد)

میں پہلی بار تعلیم و تربیت میں شرکت کر رہا ہوں۔ امید ہے میرا خط ضرور شائع ہوگا۔ میں دو سال سے یہ رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ اس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اس شمارے میں تمام کہانیاں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں۔ سندباد جہازی، جذبہ، اجنبی، کھڑ کھاند گروپ اور عہد پہلے نمبر پر تھیں۔ زندگی رہی تو پھر آپ کے دروازے پر دستک دیں گے۔ (محمد بلال عارف سیٹھی، پل بھوال)

میں تعلیم و تربیت کی مسلسل قاریہ بن چکی ہوں۔ پچھلی بار خط لکھا تھا مگر شائع نہیں ہوا۔ جنوری کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ کہانیاں عہد، جذبہ اور کھڑ کھاند گروپ بہت پسند آئیں۔ (کشف نور، لاہور)

اس بار تعلیم و تربیت ہمیشہ کی طرح ٹاپ پر رہا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ میں آپ سے ناراض ہوں۔ آپ میرے خط کا جواب نہیں دیتیں۔ (منابل نسیم، اسلام آباد)

☆ اب آپ خوش ہیں۔ ناراضگی ختم کر دیں۔

تعلیم و تربیت ایک منفرد اور سبق آموز رسالہ ہے۔ اس رسالے میں جو معلومات ہمیں ملتی ہیں، وہ ہمیں لائبریریوں سے بھی نہیں ملتی۔ اوجھل خاکے میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ (محمد شاہد جمہ، لاہور)

☆ آپ کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ!

میں بہت عرصے کے بعد تعلیم و تربیت میں شرکت کر رہا ہوں۔ اس مرتبہ رسالہ ٹاپ پر تھا۔ جذبہ، ہدایت، اجنبی اور کھڑ کھاند گروپ بہترین کہانیاں تھیں۔ سات فروری کو میری سال گرہ ہے۔

☆ آپ کو سال گرہ مبارک ہو۔ آپ کے لیے بہت سی دعائیں۔

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ 13 فروری کو میرے کزن عبدالہاد کی پہلی سال گرہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی اس کو سال گرہ کی مبارک باد دیں۔ جنوری کا شمارہ بھی بہت زبردست تھا۔ کہانی اجنبی، نئے سال کا تحفہ اور کھڑ کھاند گروپ نے شہد کا ٹا بہت ہی عمدہ تھیں۔ امید کرتی ہوں آپ مجھے جواب ضرور دیں گی اور آپ میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گی۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ آمین! (مقدس چوہدری، راول پنڈی)

ڈیئر ایڈیٹر، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب لوگ؟ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے ایک سال مکمل ہو گیا ہے۔ یہ بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ میری وجہ سے میری بہت سی دوستوں نے بھی اسے پڑھنا شروع کیا۔ اس بار میرا "دماغ لڑاؤ" میں انعام بھی نکلا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے (آمین)۔ (عدن سجاد، جھنگ صدر)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت عجیب اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

محمد حمزہ، میاں والی۔ پلوشہ مریم، پشاور۔ شہزادی خدیجہ شفیق، نعمان حیدر، اقصیٰ شمشیر، عبدالجبار روحی، عائشہ مجید، محمد احمد مغل، مریم اعجاز، عشوا شکیل، منیبہ شہباز، لاہور۔ ریشا نور، اسلام آباد۔ زنیرہ جاوید بٹ، گوجرانوالہ۔ ارم گل، کرن فاروق، ماہ نور عمر فاروق، گوجرانوالہ۔ حافظ محمد منیب، وزیر آباد۔ توصیف مصنف، نوشہرہ کینٹ۔ عبدالجبار سیال، ڈیرہ غازی خان، کنزہ رانی، بھمبر۔ دردہ زہرہ، عدن سجاد، جھنگ۔ صفا قصور، میرپور۔ بادیہ ایمن، جہلم۔ جنت مہر علی، ٹانک۔ شکیل الرحمٰن، شرق پور۔ زینب سحر، سارہ مسعود، محمد ذوہیب فراز۔ محمد شکیب مسرت، محمد شاہ زیب، فاطمہ حسن، بہاول پور۔ ماریہ عبدالعزیز، نکودر کوٹ۔ حافظہ مہدیہ آصف، علی پور چٹھہ۔ سید محمد موسیٰ، کراچی۔ خولہ اصغر، نندوال۔ محمد حسن معاویہ، میمونہ۔ ڈیرہ اسماعیل خان۔ ابرار خان، کوئٹہ۔ مریم جاوید، زونیرہ جاوید، احسن آفاق، بینش آفاق، کراچی۔ وقار صادق، کرن بٹ، راول پنڈی۔ جلیل احمد رضوان، مجید احمد، لطیف احمد بٹ، گوجرانوالہ۔ ارسلان صدیقی، فیضان صدیقی، سعدیہ صدیقی، ایبٹ آباد۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری پوسٹنگ بطور فاریسٹ آفیسر محکمہ وائلڈ لائف میں آزاد کشمیر کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی تھی۔ وہ قصبہ پہاڑی سلسلے کے سنگم میں واقع تھا، جس کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ میں نے اپنے آفس کا چارج لیا اور اپنے عملے کے ہمراہ علاقے کا جائزہ لیا۔ گاؤں کے اکثر لوگ بھیڑ بکریاں چراتے تھے جب کہ کچھ لوگ نوکری پیشہ اور تجارت سے بھی وابستہ تھے۔ میں اکثر دن کو جنگل میں گشت کرتا رہتا تھا جب کہ کبھی کبھار رات کو بھی جنگل کا چکر لگایا کرتا تھا۔ جنگل بڑا ہی خطرناک اور جنگلی جانوروں سے بھرا رہتا تھا لیکن ابھی تک مجھے شیر یا چیتا کہیں بھی دکھائی نہیں دیا تھا حالاں کہ گاؤں والوں سے چیتے کی کافی کہانیاں سن چکا تھا کہ وہ ان جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمارا آفس گاؤں کے کچھ ہی فاصلے پر تھا اور گاؤں والے ہمارے اسٹاف سے بھی کافی مانوس تھے۔ سو مجھے وہاں سیٹل (Settle) ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

ایک دن میں اپنے آفس میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک دیہاتی دوڑتا ہوا آیا اور سیدھا میرے آفس میں داخل ہوا۔ وہ پھولے ہوئے سانسوں سے بولا۔ ”صاحب جی! صاحب جی! وہ جنگل سے ایک چیتا آیا اور چاچا فضلو کی بکری کو شکار کر کے لے گیا۔“

”ارے بھائی! کون چاچا فضلو اور کیسا چیتا......؟ یہاں پر کوئی چیتا ویتا نہیں ہے...... اور یہ گاؤں والے اس قسم کی افواہ کیوں پھیلاتے ہیں......؟“

میرے اس جواب پر وہ بولا۔ ”معاف کرنا صاحب جی، لیکن یہ حقیقت ہے۔ آپ خود وہاں جا کر گاؤں والوں سے پوچھ سکتے ہیں۔“

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم سیدھا چاچا فضلو کے گھر آئے اور اس سے واقعے کی تفصیلات معلوم کیں۔ چاچا فضلو بولا۔ ”صاحب جی! میں اپنی بھیڑ بکریاں قریب والے جنگل کے پاس چرا رہا تھا کہ اچانک ایک چیتا جنگل سے نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری ایک بکری کو پنجے سے پکڑا اور مار ڈالا اور اپنے نوکیلے دانتوں میں جکڑ کر اپنے ساتھ اُٹھا کر جنگل میں لے گیا۔“

”تمہیں یقین ہے وہ چیتا ہی تھا؟“ میرے اس سوال پر اس نے کہا۔ ”صاحب! میں نے غور سے دیکھا تھا وہ چیتا ہی تھا اور یہ وہی چیتا ہے جو کافی عرصے سے گاؤں والوں کی بھیڑ بکریاں شکار کر کے جنگل میں چلا جاتا ہے، اور تو اور اس نے کافی لوگوں کو زخمی بھی کیا ہے جیسا کہ آپ نے پہلے بھی گاؤں والوں کی زبانی سنا ہوگا۔“

چاچا فضلو کی باتیں سن کر میں واپس اپنے آفس آیا اور اپنے ماتحت عملے سے پوچھا کہ گاؤں والوں کی بات کہاں تک ٹھیک ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بھی اس قسم کی باتیں سن رکھی ہیں لیکن آج تک کسی نے بھی اپنی آنکھوں سے اس چیتے کو نہیں دیکھا۔

”ہاں صاحب! یاد آیا، ایک رات چوکی دار کہہ رہا تھا کہ مجھے

دور جنگل سے چیتے کے دھاڑنے کی کچھ آوازیں ضرور سنائی دی تھیں کیوں کہ اس کے دھاڑنے کی آواز باقی جانوروں سے الگ ہوتی ہے۔" عابد چوکی دار کی بات سن کر اب مجھے بھی لگ رہا تھا کہ گاؤں والے صحیح کہہ رہے ہیں۔ خیر پھر میں نے بھی اپنے طور پر اس چیتے کی تلاش شروع کر دی اور روزانہ جنگل میں جا کر اس کا ٹھکانہ تلاش کرنے لگا۔ یہ کافی خطرناک کام تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ایک دن میری تلاش ختم ہو جائے گی۔

ایک دن حسب معمول میں کام میں مصروف تھا کہ گاؤں میں اچانک شور برپا ہو گیا۔ میں بھی جلدی جلدی وہاں پہنچا، سارے گاؤں والے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے اور درمیان میں ایک چارپائی پر ایک لاش پڑی تھی جسے دیکھ کر سارے رو رہے تھے۔ پتا چلا کہ گاؤں کے ایک غریب چرواہے کو چیتے نے زخمی کر دیا تھا جو زخموں کی تاب نہ لا سکا اور فوت ہو گیا۔ میں نے گاؤں والوں سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا تو انہوں نے بتایا کہ فوت ہونے والا شخص صبح سویرے اپنی بھیڑ بکریاں چرانے پاس والے جنگل میں گیا تھا کہ اچانک ایک خونی چیتا جنگل سے نمودار ہوا اور اس چیتے نے بھیڑ بکریوں کی بجائے غریب چرواہے کا شکار کیا اور اس کو زخمی کر کے مار ڈالا۔ سارے گاؤں والوں نے مجھے کہا کہ اگر محکمہ وائلڈ لائف نے اس مرتبہ بھی کچھ نہیں کیا تو سارے گاؤں والے اکٹھے ہو کر اس چیتے کو مار ڈالیں گے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ آپ لوگ اس طرح جنگلی جانوروں کو نہیں مار سکتے اور جنگلی جانوروں کا تحفظ ہم سب پر فرض ہے، باقی رہا وہ چیتا تو اس کو پکڑنا ہمارا کام ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس چیتے سے بہت جلد نجات دلاؤں گا۔ میں آج ہی اپنے محکمے سے اس مسئلے پر بات کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ کوئی اچھا حل نکل آئے گا۔" میری اس بات پر گاؤں والے مطمئن ہو گئے۔ میں نے آفس آ کر سب سے پہلے اپنے بالا افسر کو اطلاع دی اور ان سے چیتے کو زندہ پکڑنے کی اجازت بھی مانگی۔ معاملے کی نوعیت کے پیش نظر اس نے مجھے اجازت دے دی کہ چیتے کو زندہ پکڑ کر شہر کے چڑیا گھر میں بھجوا دیا جائے اور پھر میں تیاری کرنے لگا۔

چیتے کو پکڑنے کے لیے ہمیں کچھ سامان درکار تھا۔ ان میں کچھ چیزیں پہلے ہی موجود تھیں جب کہ بقیہ چیزیں ہم نے بازار سے منگوائیں۔ میں نے اپنے دفتر کے اسٹاف کو بلایا جو کہ 6 افراد پر مشتمل تھا۔

"ساتھیو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمیں یہاں جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے تعینات کیا گیا ہے، ان میں خون خوار جانور بھی شامل ہیں۔ ہمیں انہیں مارنے کے بجائے زندہ پکڑنا ہوگا اور چیتے کے متعلق تو آپ لوگوں کو معلوم ہی ہوگا کہ اس نے کس طرح گاؤں والوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے۔ اگر گاؤں والے اپنے طور پر ایک ایک کر کے ان جانوروں کو ماریں گے تو یہ پورا جنگل جانوروں سے خالی ہو جائے گا، سو ہمارا فرض ہے کہ جانوروں کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کا تحفظ بھی یقینی بنائیں۔ میرا پلان یہ ہے کہ کل دوپہر کو ہم سارے لوگ چیتے کو زندہ پکڑنے کا سامان لے کر جنگل کو جائیں گے۔ چاہے ہمیں کتنے ہی دن لگ جائیں، ہم چیتے کو تلاش کر کے اسے زندہ پکڑیں گے اور اگر ہر چیز پلان کے مطابق ہوئی تو ان شاء اللہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ ابھی آپ لوگ تیاری کر لیں، جب تک میں مطلوبہ سامان کا جائزہ لیتا ہوں۔" ہمارے اسٹاف میں سارے افراد تعاون کرنے والے تھے اور وہ میری سربراہی میں اس خطرناک مہم پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بعدازاں میں نے سامان کا معائنہ کیا۔ سامان میں ایک بڑا لوہے کا پنجرہ جس میں چیتا بڑی آسانی سے اندر سما سکتا تھا، چند مضبوط رسیاں، کچھ ڈنڈے، ٹارچ بیٹری، کھانے پینے کا سامان، کپڑے لتے، ٹینٹ، گینتی بیلچہ، چیتے کو پکڑنے کے لیے ایک بکری کا بچہ اور بھی ضرورت کا بہت سارا سامان ہم نے لیا اور ہاں اپنے تحفظ کے لیے کچھ بندوقیں بھی ساتھ رکھیں تاکہ کسی خطرے کی صورت میں ہم لوگ اپنی حفاظت بھی کر سکیں۔ سامان کے معائنے کے بعد میں نے گاؤں والوں کو بلایا اور انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا: "دیکھو بھائیو! ہم لوگ تیار ہیں اور کل ہم چیتے کو پکڑنے جا رہے ہیں۔ آپ بس صبر اور تحمل سے کام لیں اور ہماری ٹیم کے لیے دعا کریں تاکہ ہم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔" گاؤں والوں نے ہمیں خوب دعائیں دیں، سبھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

دوسرے دن پلان کے مطابق ہم لوگ مطلوبہ سامان لے کر جنگل میں آ گئے، آگے آگے میں چل رہا تھا اور میرے پیچھے اسٹاف کے باقی لوگ۔ میرے علاوہ دو بندوں کے ہاتھ میں بندوق تھی جب کہ چار بندے پنجرہ اور باقی سامان اٹھائے میرے پیچھے پیچھے آ

رہے تھے۔ چوں کہ اس مہم کا انچارج میں تھا، اس لیے سب مجھے Follow کر رہے تھے۔ جنگل میں چلتے چلتے شام ہو گئی تھی۔ جنگل کافی گھنا تھا، ہر طرف پرندوں اور جنگلی جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم بڑی احتیاط سے چیتے کے ٹھکانے کی تلاش کر رہے تھے۔ چوں کہ وہ پہاڑی جنگل تھا، اس لیے ہمیں یقین تھا کہ چیتا کسی چھوٹے موٹے غار میں ہی رہتا ہوگا۔ اندھیرا ہونے کو تھا، اس لیے میں نے اپنے اسٹاف سے کہا: ''ساتھیو! اندھیرا ہونے سے پہلے ہمیں اپنے رہنے کے لیے ٹینٹ لگانے چاہئیں۔ باقی تلاش کل کریں گے۔'' میرے کہنے کے مطابق ایک جگہ کا انتخاب کیا گیا اور وہیں پر ٹینٹ لگانے شروع کر دیے۔ یہ جگہ جنگل کے بالکل درمیان میں تھی اور پاس ہی پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بھی بہہ رہی تھی۔ کافی محنت کے بعد ہم نے ٹینٹ لگا دیے اور اپنا اپنا سامان وغیرہ سیٹ کر کے رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ چوں کہ سردی کے دن تھے، اس لیے ہم نے کافی سوکھی لکڑیاں اکٹھی کی ہوئی تھیں اور ان میں آگ لگا کر ہم لوگ اپنے اپنے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ سب نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ رات کا کھانا کھا کر کافی دیر تک ہم لوگ آگ کے قریب بیٹھے رہے اور گپ شپ کرتے رہے۔ ویسے اس قسم کی مہم سے ہمارا پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا۔ ویسے فلموں میں ہی یہ سب دیکھنے کو ملتا ہے۔ رات کو جنگل اور بھی زیادہ خوف ناک لگ رہا تھا۔ دور سے پرندوں کے چلانے کی آوازیں اور گیدڑ کے چیخنے سے ماحول اور بھی وحشت ناک ہو گیا تھا۔ جب تک آگ جلتی رہی ہم لوگ بھی بیٹھے رہے اور آگ کے بجھتے ہی ہم لوگ سونے کی تیاری میں لگ گئے۔ تین بندوں کو پہرہ دینے کے لیے منتخب کیا جو باری باری پہرہ دیتے رہے۔ رات دیر سے کس وقت آنکھ لگی، پتا ہی نہیں چلا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو جنگل کی صبح دیکھنے کے لائق تھی۔ ہر طرف پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں ایک مسحور کن کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے جنگل کی صبح کو اپنے کیمروں میں قید کیا۔ میں نے سارے ساتھیوں سے خیریت پوچھی اور ناشتا وغیرہ کر کے پھر اپنی ہم

کے لیے نکل پڑے۔ پورا دن تلاش کے بعد شام کو ہمیں کچھ جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا غار نما کھنڈہ نظر آیا جس کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہم لوگ وہاں رُک گئے۔ میں نے دیکھا کہ اس جگہ ہر طرف ہڈیاں ہی ہڈیاں بکھری پڑیں تھیں اور اس غار نما کھنڈے کے قریب کچھ گوشت بھی نظر آیا جو کافی گلا سڑا ہوا تھا۔ ہم سب نے سوچا، ہو نہ ہو یہ وہی جگہ ہے جہاں وہ چیتا رہتا ہے۔ ہم نے ذرا قریب سے دیکھا تو ہمیں کچھ پیروں کے نشان بھی نظر آئے جس سے ہمارا شک یقین میں بدل گیا، کیوں کہ وہ نشان ہو بہو چیتے کے پاؤں جتنے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ چیتا اسی غار میں رہتا ہوگا اور وہ رات کو یہاں پر ضرور آئے گا، سو ہمیں اس کو قابو کرنے کے لیے اسی جگہ اس پنجرے کو رکھنا پڑے گا۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟''

سب لوگوں نے میری تائید کی تو میں نے وہ لوہے کا پنجرہ غار کے قریب ہی رکھوایا اور بکری کے بچے کو پنجرے کے اندر باندھ دیا۔ پھر ہم نے رسّوں سے پنجرے کے دروازے کو باندھا اور ان رسّوں کا ایک سرا جھاڑیوں میں چھپا دیا تاکہ جوں ہی شیر اندر پنجرے میں داخل ہو تو ہم لوگ رسّوں کو کھینچ کر فوراً دروازہ بند کر دیں۔ شام ہونے لگی تھی اور ہم نے بھی چیتے کو پکڑنے کا سامان

اچھی طرح لگایا اور قریب ہی گھنی جھاڑیوں میں جا کر چھپ گئے۔ میرے ہاتھ میں بندوق تھی کہ اگر چیتا ہم پر حملہ کر دے تو ہم لوگ اپنی حفاظت کر سکیں۔ سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”اندھیرا ہوتے ہی چیتا اپنی غار میں ضرور آئے گا، آپ لوگ بالکل احتیاط سے اپنی اپنی جگہ پر موجود ہوں اور کسی بھی قسم کی حرکت مت کریں جس سے چیتے کو ہماری موجودگی کا شک ہو جائے۔“ آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا اور ہم لوگ بھی الرٹ ہونے لگے۔ ہم نے پنجرے کے پاس تھوڑی سی روشنی کا بندوبست بھی کیا تھا تاکہ ہمیں کچھ نظر آ سکے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارا تجسس بھی بڑھتا گیا۔ ہمیں انتظار کرتے کافی وقت گزر گیا تھا کہ اچانک دور سے ہی ہمیں چیتے کے دھاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔ ہماری نگاہیں پنجرے کی طرف تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چیتا ہمارے سامنے آ گیا۔ چیتا جیسے ہی غار کے قریب آیا تو اس کی نظر پنجرے میں موجود بکری کے بچے پر پڑی جو چیتے کو دیکھ کر زور زور سے چلّانے لگا۔ چیتے کو ماحول میں تبدیلی کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن وہ دن بھر کا بھوکا تھا اور بکری کے بچے کو دیکھ کر زور سے غرایا اور غصے سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہم لوگ تو پہلے ہی سانسیں روکے بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر چیتے کو ہماری موجودگی کا شک ہو گیا تو ہماری خیر نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں حوصلہ دیا کیوں کہ ہم ایک نیک مقصد کے لیے نکلے تھے اور نیک کام میں اللہ تعالیٰ بھی مدد کرتا ہے، سو ہمارے حوصلے بلند تھے۔ چیتے نے پہلے چاروں طرف دیکھا اور پھر وہ آہستہ آہستہ پنجرے کی طرف بڑھنے لگا اور پھر وہ پنجرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے ایک ہی پنجے سے بکری کے بچے کا کام تمام کر دیا۔ ہم لوگوں نے بھی فوراً رسیوں کو کھینچ کر پنجرے کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر کیا تھا پنجرے کا دروازہ بند ہوتے ہی چیتا زور زور سے دھاڑنے لگا۔ اس نے اپنا شکار چھوڑ دیا اور زور زور سے پنجرے کی سلاخوں کو ٹکر مارنے لگا اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ چیتا پنجرے میں پھنس چکا تھا۔ ہم لوگ بھی جھاڑیوں سے باہر نکل آئے اور جلدی سے ایک بڑا تالا اس پنجرے کے دروازے پر لگا دیا۔ چیتے نے ہم لوگوں کو دیکھ کر اور بھی زیادہ دھاڑنا شروع کر دیا، لیکن اب کیا فائدہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، چیتے کو پنجرے میں دیکھ کر ہم سب لوگ بہت خوش ہوئے اور اپنی مہم کی کامیابی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے پنجرے میں قید چیتے کے ساتھ اپنی اپنی تصویریں بھی بنوائیں اور اپنا سامان وغیرہ سنبھال کر چیتے کو پنجرے سمیت ہی گاؤں لے کر آ گئے۔ پھر تو پورے گاؤں میں ہماری کامیابی پر جشن کا سا سماں ہو گیا۔ چیتے کو دیکھنے سارا گاؤں اُمنڈ آیا کیا۔ چھوٹا بڑا، مرد، عورتیں اور تو اور دوسرے گاؤں سے بھی لوگ چیتے کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ ہم نے پنجرہ بیچ گاؤں میں رکھ دیا۔ سارے گاؤں والے ہمیں دعائیں دے رہے تھے۔ اگلے دن میڈیا سے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے تھے اور انہوں نے بھی کافی کوریج کی۔ ہمارے محکمے نے چیتے کو شہر کے چڑیا گھر میں بھجوا دیا اور حکومت نے ہماری کامیابی پر خوش ہو کر ہمیں کچھ انعام سے بھی نوازا۔ میں نے تو وہ رقم گاؤں کے ان افراد میں تقسیم کر دی جن کا چیتے نے کافی نقصان کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد میری پوسٹنگ آزاد کشمیر سے سندھ میں ہو گئی۔

☆☆☆

گفتگو ایک فن ہے!

گفتگو ایک ایسا فن ہے جو ایک طرف تو انسانی شخصیت کو چار چاند لگا دیتی ہے تو دوسری جانب بسااوقات شخصیت کی دھجیاں بھی بکھیر سکتی ہے کیوں کہ خاموشی، عالم کے لیے زیور اور جاہل کے لیے جہالت کا پردہ ہے۔ اکثر افراد کی گفتگو سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اتنے بلند ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیاں ان کے سامنے کچھ نہیں، لیکن ان کی روح کی پیمائش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی بھی تاریک غاروں میں رینگ رہے ہیں۔ بلاشبہ انسان کی شخصیت کا سب سے مضبوط حوالہ اس کا کردار و عمل ہے اور کردار و عمل کو انسانی گفتگو چار چاند لگا دیتی ہے۔

عام لوگوں میں یہ تاثر ہے کہ جو زیادہ بولے وہ ظرف میں کم اور جو چپ رہتا ہے وہ ظرف والا ہے کیوں کہ جو شخص دوسرے کی باتوں کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے، وہ بھی کوئی خاص تاثر قائم نہیں کر سکتا۔ دوست احباب اسے مغرور تصور کرتے ہیں۔ اس لیے گفتگو کرتے وقت انتہائی محتاط رویہ اپنانا چاہیے۔ الفاظ کا استعمال انتہائی محتاط ہو کر کرنا چاہیے کیوں کہ زیادہ بولنا بھی اپنا تاثر کھو دیتا ہے، چاہے انسان کے الفاظ ملکِ عدن کے موتی ہی کیوں نہ ہوں۔ مختصراً اپنے لفظوں کی حفاظت کریں کیوں کہ لفظ آپ کی عادت بن جاتے ہیں۔ عادت کی حفاظت کریں کیوں کہ عادتیں آپ کا عمل بن جاتی ہیں۔ اپنے عملوں کی حفاظت کریں کیوں کہ آپ کے عمل ہی آپ کی شخصیت بناتے ہیں۔

نورالعین گیلانی، فیصل آباد

رونی صورت

رفیق احمد خاں

ہونٹوں کو کاٹتا ہے اور منہ بسورتا ہے!
آنکھیں نکالتا ہے، روتا ہے، گھورتا ہے!
اسکول ہو کہ گھر ہو، رونا ہے کام اس کا
لوگوں نے رونی صورت رکھا ہے نام اس کا
چانٹے ہی کھاتے کھاتے گزری ہے عمر ساری!
امی نے کان اینٹھے، ابا نے لات ماری!
گھر بھر کی جھڑکیوں سے پڑتا ہے اس کو پالا
لیکیں اُدھر سے باجی، بھاگیں ادھر سے خالا
ہے اس کے آنسوؤں کی اک اور بھی بُرائی
روتا ہے یہ تو اس پر ہنستے ہیں بہن بھائی
ہے دیکھنے کے قابل پھر اس کا سٹپٹانا!
اُٹھنا، مچل کے گرنا، پھر خود کو کاٹ کھانا
اس وقت اس کی باجی کہتی ہیں ''میرے بھائی!
فوٹو اُتارنے کی اصلی گھڑی اب آئی!
رونے سے کتنی پیاری لگتی ہے تیری صورت
اے کاش تو بھی دیکھے، یہ کانٹی سی مورت
سرخی ہے کس غضب کی چہرے پہ کیا بتاؤں
بہتر یہی ہے تجھ کو میں آئینہ دکھاؤں
آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی سی اِک رواں ہے
رونے میں آج تیرا ثانی بھلا کہاں ہے!''
باجی کی باتیں سن کر ہے خوب تلملاتا
مکے دکھا دکھا کر ہے مارنے کو آتا!
ہم جولیوں میں بھی یہ بدنام ہو چکا ہے!
رونے کا اس کے چرچا اب عام ہو چکا ہے!

سلطنتِ مغلیہ کا تاج دار نور الدین جہانگیر کشمیر کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اپنی سوانح عمری تزک جہانگیری میں لکھتا ہے کہ کشمیر ایک سدا بہار اور مضبوط ترین قلعہ ہے۔ بادشاہوں کے لیے ایک عشرت افزا اور درویشوں کے لیے ایک دل کشا خلوت کدہ ہے۔ اس کے خوش نما چمن اور دل کش آبشار شرح و بیان سے باہر اور آب رواں اور دریائی چشمے بے حد ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ اور آب رواں دکھائی دیتا ہے۔ گل سرخ، بنفشہ، خورد نرگس، صحرا صحرا کھلے ہوئے ہیں۔ قسم قسم کے پھول اس قدر ہیں کہ شمار نہیں ہو سکتا۔ موسم بہار میں پہاڑ اور جنگل، قسم قسم کے شگوفوں سے مالا مال اور مکانوں کے در و دیوار اور صحن و بام لالہ کی مشعلوں سے جگمگا رہے ہیں۔

شہنشاہ نور الدین جہانگیر بسترِ مرگ پر ہے۔ درباریوں نے پوچھا: ''حضور فضیلت مآب کی کوئی خواہش ہے؟'' جہانگیر نے آہ بھر کر کہا۔ ''صرف کشمیر۔''

ریاست جموں کشمیر بھارت کے شمال مغرب اور پاکستان کے شمال مشرق میں ایک متنازعہ ریاست ہے جس کے ایک حصے پر بھارت نے تقسیم برصغیر کے بعد سے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ یہی وہ قضیہ ہے جس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان میں کشیدگی چلی آ رہی ہے۔

یہ ریاست حسن و خوب صورتی کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس میں بلند و بالا پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں جن میں کوہ ہمالیہ اور کوہ قراقرم قابلِ ذکر ہیں۔ دریائے جہلم شہر سری نگر سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ وادی بڑی زرخیز اور پُر رونق ہے۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر کا رقبہ اٹھاون ہزار مربع میل ہے۔ اس کا دارالحکومت سری نگر ہے جب کہ آزاد کشمیر کا رقبہ پچیس ہزار مربع میل ہے اس کا دارالحکومت مظفر آباد ہے۔ کشمیر کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ستتر (77) فی صد ہے۔

وادیٔ کشمیر میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ آنکھوں میں خود بخود طراوت آتی ہے۔ دل میں سکون اور ٹھنڈک کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ سینکڑوں کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی وادی میں جگہ جگہ پہاڑوں کے کنارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں جگہ جگہ چشمے و جھیلیں اور نہریں چاندی کی طرح دمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں قدرت کا حسن اپنے عروج پر ہے۔

جھیلوں میں کنول کے پھول عجیب نظارہ دیتے ہیں۔ وادی کی بیشتر جھیلیں دریائے جہلم سے جا ملتی ہیں جس کا اپنا منبع بھی خود کشمیر میں ہے۔

سری نگر مقبوضہ کشمیر کا دارالحکومت، نہروں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ یہ دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔ عمارتیں قدیم زمانے کی ہیں۔ شہر کے عین وسط میں شاہ ہمدان کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔

آزاد کشمیر کا شہر میرپور بھی بہت خوب صورت ہے، دریائے جہلم کے کنارے منگلا جھیل سے 15 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں منگلا کا پُرانا قلعہ بھی ہے۔

کشمیر جنت نظیر کا ایک خوش گوار اور فرحت بخش پہلو یہاں کی پہاڑی چراگاہیں ''پامرگ'' اور ''سونمرگ'' ہیں۔ یہ نسبتاً زیادہ اُونچائی پر واقع ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی ہیں، اسی لیے انگریزوں نے یہاں تفریحی مراکز قائم کیے تھے۔ چراگاہوں میں تقریباً تمام اقسام کے مویشی اور ڈھوڑ ڈنگر چرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی بھیڑ، بکریاں، گائے اور گھوڑے۔ یہاں ایسی بکریاں بھی ہوتی ہیں جن کے دُم نہیں ہوتی۔ ان کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ بھینسیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

کشمیر کی حسین و جمیل سرزمین پر ہزاروں صاف و شفاف چشمے اور دل کش جھیلیں ہیں۔ جھیل ڈل کشمیر کا آئینہ ہے جو سری نگر کے عین وسط میں ہے۔ سیاحوں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ دُنیا بھر میں جھیل ڈل کی خوب صورتی لاجواب ہے۔ اس جھیل کے مثل کسی اور ملک میں کوئی جھیل نہیں۔

قدرتی مناظر اور حسن و زیبائی میں جھیل ڈل کے مشابہ ایک اور جھیل ''جھیل ولر'' ہے۔ یہ جھیل ڈل کی بہ نسبت بڑی اور وسیع ہے۔ کشمیر کی یہ جھیل سب سے بڑی اور دل کش جھیل ہے۔

کشمیر کی خاص بڑی بڑی جھیلوں کے علاوہ سینکڑوں چھوٹی جھیلیں بھی ہیں جو اس خطۂ حسین و جمیل کے طول و عرض میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے دو شفاف جھیلیں ''تارسر'' اور ''مارسر'' ہیں۔

کشمیر جنت نظیر میں مغلیہ بادشاہوں کے باغات قابل دید ہیں۔ شالامار باغ، نشاط باغ اور چشمہ شاہی خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ باغات شہنشاہ جہانگیر اور اس کے بیٹے شاہ جہان نے بنوائے تھے۔ باغات فن اور فطرت کے امتزاج کے حسین ترین نمونے ہیں۔ شالامار باغ جھیل ڈل سے ذرا ہٹ کر بنا ہوا ہے لیکن نشاط باغ عین جھیل کے کنارے کھلا ہوا ہے۔ یہ باغات کسی زمانے میں مغل بادشاہوں کی آرام گاہیں تھیں۔

سیاح ملکوں ملکوں کی سیر کرتے ہیں لیکن جو خوشی اور سکون انہیں کشمیر کے اندر ٹہلتے ہوئے قدرتی حسن سے ملتا ہے وہ کسی اور ملک میں نہیں ملتا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی قدرتی ہریالی آنکھوں کو سکون اور ٹھنڈک بخشتی ہے۔ سیاحوں کا جی چاہتا ہے کہ یہیں کے ہو رہیں اور اسے کبھی الوداع نہ کہیں۔

شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ کا کشمیر کے ساتھ گہرا ذہنی، فکری اور آبائی تعلق تھا۔ علامہ اقبالؒ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ خطۂ کشمیر جائیں، چنانچہ آپ جون 1920ء میں کشمیر گئے۔ اس سفر کے بعد آپ نے تین نظمیں کشمیر کے موضوع پر لکھیں، جو آپ کی کتاب ''پیامِ مشرق'' میں شامل ہیں۔ آپ نے کشمیر کے متعلق کئی اشعار کہے:

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائے داد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

کشمیر کے بارے میں آپ کا یہ شعر زبانِ زدِ عام ہے:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

☆☆☆

جنوری 2015ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- آدمی نے سردی کا مزہ اٹھایا، برف کو آئس بابا کی کار گراؤنڈ بنایا (لائبہ ایوب، کراچی)
- کیوں ہو رہے ہو حیران، یہ ہے کار کی نئی پہچان (شمائل آصف، لاہور)
- طریقہ ہمارا لاجواب، برف پہ چل گئی کار (نور العین رضا، اسلام آباد)
- برف باری تو ہو رہی ہے ضرور لیکن ہم بھی ہیں عادت سے مجبور (مریم کاشف، حیدرآباد)
- تبدیلی آنہیں رہی آ گئی ہے۔ (ضیاء الدین، لاہور)

اَن٘ہونہار مصور

نیا سال

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

سمیع اللہ اقبال، گوجرانوالہ (پہلا انعام 195 روپے کی کتب)

مریم جاوید، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

ارم گل، گوجرانوالہ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

محمد نعمان اسحاق بٹ، گوجرانوالہ (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

جویریہ رمضان تونسوی، ملتان (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی: اشعل یاسر، عائشہ یاسر، فیصل آباد۔ عائشہ ظفر، ثمرہ غفار، تماضر ساجد، زین العابدین شاہ، رحیم یار خان۔ محمد ابراہیم قریشی، کوہاٹ۔ خریشہ بتول، راول پنڈی۔ سمیعہ توقیر، صناء رشید، کراچی۔ سیدہ تحریم مختار، جویریہ یونس، آصف علی، مستجان علی، عبداللہ نوید، حیدر علی راشد، لاہور۔ سدرہ سعادت، منیب عمر، اسلام آباد۔ ایمن نجیب، میر پور آزاد کشمیر۔ ریشا نور، اسلام آباد۔ محمد عارف، چوک۔ فاطمہ الزہرا، زین احمد قریشی، فیصل آباد۔ محمد ابراہیم لطیف، ملتان۔ راحمہ رانا، قدر دار، عبداللہ ارشد، گوجرانوالہ۔ توصیف مصنف، نوشہرہ کینٹ۔ زینب خان، ندا خان، پشاور۔ ارمین احمد، منال احمد، فائزہ رضا، عفیفہ مغل، گجرات۔ مریم گل، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سدرہ مسعود، راول پنڈی۔ شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ حمزہ اکرام، جہلم۔ عبدالرحمٰن عمر، اسلام آباد۔ حبیبہ مجید۔ اذکی آصف، پشاور۔ عثمان اکرم، ملتان۔ عائشہ محبوب، زینب محبوب، جہلم کینٹ۔ طیبہ طاہر، جھنگ۔ محمد عرفان آفریدی، خیبر ایجنسی۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

فروری کا موضوع: لائبریری — آخری تاریخ 8 فروری

مارچ کا موضوع: موسم بہار — آخری تاریخ 8 مارچ